۱۳ بہار ۱۹۹۳

آج

ترتیب : اجمل کمال

خصوصی شمارہ : عربی کہانیاں

توفیق الحکیم عبدالسلام العجیلی زکریا تامر محمد برادا
علیفہ رفعت حنان شیخ بہاء طاہر محمود دیاب
ابراہیم الکونی یوسف ادریس یوسف شارونی ادورد الخراط
طیب صالح نبیل جورجی محمد خضیر غسان کنفانی

آج کی کتابیں

Scanned with CamScanner

آج
اپریل - جون ۱۹۹۲

اہتمام
آج کی کتابیں
بی ۱۴۰ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

کمپوزنگ
پبلشرز یونائیٹڈ
۸۷ دارالامان کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی

طباعت
ایجوکیشنل پریس
پاکستان چوک کراچی

آج کے اس شمارے میں جدید عربی کہانیوں کا ایک مختصر انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ عربی ادب کا جغرافیائی دائرہ بہت وسیع ہے۔ عربی زبان ایشیا اور افریقا کے متعدد ملکوں میں بولی، لکھی اور پڑھی جاتی ہے، اگرچہ عربی ثقافت اور ادب کے میدانوں میں مصر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ موجودہ انتخاب میں مصر کے علاوہ لبنان، شام، مراکش، عراق، لیبیا، سوڈان اور فلسطین کے لکھنے والوں کی کہانیاں شامل ہیں۔ جغرافیائی اور تہذیبی عوامل کی رنگارنگی کے علاوہ عربی ادب، اور عربی فکشن، پر مختلف مقامی اور عالمی ادبی تحریکوں کے اثرات موجود ہیں جن میں سے بعض کی جھلک آپ کو اس شمارے میں شامل کہانیوں میں نظر آ سکے گی۔ اردو کی طرح عربی میں بھی جدید فکشن کا ظہور مغرب کے ساتھ تہذیبی تفاعل کے نتیجے میں ہوا، اور فکشن کی مغربی اصناف نے کلاسیکی بیانیے کے اسالیب سے تقویت پا کر بڑی تعداد میں قابلِ قدر تحریروں کو جنم دیا۔

اس انتخاب کے بارے میں چند بنیادی باتوں کی وضاحت کرنا مناسب ہو گا۔ عربی کے جدید ادب سے اردو لکھنے پڑھنے والوں کا تعلق ویسا براہِ راست نہیں رہا جیسا ایک زمانے میں عربی کے کلاسیکی ادب کے ساتھ تھا۔ اب عام طور پر عربی تحریروں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے انگریزی ترجموں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اس انتخاب میں شامل ترجمے بھی انگریزی ترجموں سے کیے گئے ہیں۔ انگریزی زبان میں عربی فکشن کے بہت سے عمدہ انتخاب موجود ہیں۔ ایسی ہی چند کتابوں میں سے یہ کہانیاں منتخب کی گئی ہیں۔ اس کوشش کا مقصد اردو میں عربی کی جدید کہانیوں کا ایک ایسا انتخاب تیار کرنا ہے جسے کسی حد تک نمائندہ کہا جا سکے۔ ظاہر ہے کہ دو سو صفحوں پر مشتمل انتخاب سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی۔ موجودہ شمارے کو اس سمت میں پہلا قدم سمجھیے۔ ہم نے اس قسم کے کئی کئی خصوصی شمارے تیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے جو رفتہ رفتہ شائع ہوتے رہیں گے اور مل کر ایک جامع انتخاب کی تشکیل کر سکیں گے۔ یہی صورت فارسی کہانیوں کے انتخاب کے سلسلے میں اختیار کی جائے گی۔ فارسی کہانیوں کے انتخاب پر مبنی پہلا خصوصی شمارہ خزاں ۱۹۹۲ میں شائع ہو گا۔

ترتیب

۱

توفیق الحکیم

۹

بکاؤ کرامات

عبدالسّلام العُجیلی

۱۷

خواب

زکریا تامر

۲۳

دسویں دن کے شیر

محمد برّادا

۲۹

قسطوں میں حیات

۲

علیفہ رفعت

۳۹

کلب میں ایک اور شام

حنان شیخ
۴۷
قالین

بہاء طاہر
۵۴
ایک ہوشمند جوان آدمی کی نصیحت

محمود دیاب
۶۲
ایک گھر اپنی اولاد کے لیے

۳

ابراہیم الکونی
۷۳
صحرا کی دھمک

یوسف ادریس
۹۲
کرسی بردار
۹۹
بیت اللحم

یوسف شارونی
۱۰۷
موجود عبدالموجود کی زندگی کی جھلکیاں
مع دو عدد پس نوشت

Scanned with CamScanner

ادورد الخراط
۱۳۴
چار دیواروں میں

۳

طیّب صالح
۱۵۵
قبرصی

نبیل جورجی
۱۶۶
قاہرہ ایک چھوٹا شہر ہے

محمد خضیر
۱۷۴
گھوڑوں جیسی گھڑیاں

غسّان کنفانی
۱۸۹
بندے کا قلعہ

توفيق الحكيم
عبدالسّلام العُجيلى
زكريا تامر
محمد برادا

Scanned with CamScanner

توفیق الحکیم (Tewfik al-Hakim)

توفیق الحکیم ۱۹۰۲ میں اسکندریہ، مصر، میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قاہرہ اور پیرس کی یونیورسٹیوں سے قانون کی تعلیم حاصل کی اور پھر کچھ عرصے سرکاری ملازمت کرنے کے بعد خود کو مکمّل طور پر تحریر کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی شناخت بنیادی طور پر ان کے ڈراموں سے وابستہ ہے اور اس میدان میں وہ عربی ادب میں ممتاز ترین مقام رکھتے ہیں۔ لیکن انھوں نے کہانیاں اور ناول بھی لکھے ہیں۔

عبدالسّلام العُجیلی (Abdel Salam al-Ujaili)

عبدالسّلام العُجیلی ۱۹۱۸ میں شام کے مقام رقّہ میں پیدا ہوئے اور وہیں طبیب کے طور پر کام کرتے ہیں۔ لکھنے کے علاوہ انھوں نے سیاست میں بھی حصّہ لیا ہے اور کئی وزارتی عہدوں پر فائز رہ چکے ہیں، جن میں وزیرِ ثقافت کا عہدہ بھی شامل ہے۔

زکریا تامر (Zakaria Tamer)

زکریا تامر ۱۹۲۹ میں شام کے دارالحکومت دمشق میں پیدا ہوئے۔ ان کی رسمی تعلیم بہت محدود ہے لیکن انھوں نے اپنی کہانیوں کے چار مجموعوں سے عربی ادبی دنیا میں ایک نمایاں فکشن نگار کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔ ان کی کہانیوں میں، جن کا اسلوب منفرد اور شفّاف ہے، سیاسی خیالات کی جھلک محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ بچّوں کے بھی بہت مقبول ادیب ہیں۔ دمشق میں بہت سے سرکاری محکموں میں ملازمت کرنے کے بعد وہ لندن چلے گئے اور وہاں کے ایک عربی اخبار میں کام کرنے لگے۔ ۱۹۸۲ میں وہ بچّوں کی کتابوں کی اشاعت کے مشیر کی حیثیت سے کویت منتقل ہو گئے۔

محمّد بَرّادا (Mohammed Barrada)

محمد برّادا ۱۹۳۸ میں رباط، مراکش، میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے عربی کے مضمون میں ڈگری حاصل کی اور پیرس یونیورسٹی سے جدید ادبی تنقید کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کیا۔ ان کی بہت سی تنقیدی تحریریں شائع ہوئی ہیں اور انھوں نے فرانسیسی سے ترجمے بھی کیے ہیں۔ ان کی کہانیوں کا مجموعہ ۱۹۷۹ میں بیروت سے شائع ہوا تھا۔ آج کل وہ رباط یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں اور مراکشی ادیبوں کی انجمن کے صدر بھی ہیں۔

Scanned with CamScanner

توفیق الحکیم

انگریزی سے ترجمہ : عطا صدیقی

بکاؤ کرامات

طائر اپنے آشیانوں میں بیدار ہوئے تو اس کے بعد ہی حسبِ عادت پادری بھی منہ اندھیرے اٹھ کر تسبیح و عبادات اور مشرقی علاقے کے اپنے اس حلقے کے کاموں میں مشغول ہو گیا جس کی روحانی رہنمائی اس کے سپرد تھی اور جہاں کے دین دار لوگ اس کا بہت ادب اور عوام اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس کے دروازے کے سامنے پام کا ایک چھوٹا سا پیڑ تھا جو خود اس نے اپنے ہاتھوں سے لگایا تھا۔ وہ روزانہ سویرے اس پیڑ کو پانی دیتے ہوئے سورج کے کھجور جیسے سرخ کناروں کو افق سے اُبھرتے اور اپنی کرنوں سے اوس میں بھیگے پتّوں سے ٹپکتی چاندی جیسی بوندوں پر سنہری جال بُنتے دیکھتا تھا۔

اس صبح پام کو پانی دے کر پادری جیسے ہی اندر جانے کے لیے پلٹا، اس نے اپنے سامنے کچھ مغموم اور پریشان حال لوگوں کو کھڑا ہوا پایا۔ ان میں سے ایک ہمّت کرتے ہوئے آگے بڑھا اور منّت سماجت کرنے لگا۔

"فادر! ہمیں بچا لیجیے۔ آپ کے سوا کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔ میری بیوی کی جان اٹک رہی ہے اور مرنے سے پہلے وہ آپ کی دعائیں چاہتی ہے۔"

"وہ کہاں ہے؟"

"قریب کے ایک گاؤں میں۔ سواریاں تیار ہیں۔" اس آدمی نے دو کسے ہوئے گدھوں کی طرف اشارہ کیا جو ان کی سواری کے منتظر کھڑے تھے۔

"اچھا میرے بیٹو۔" پادری نے کہا۔ "بس تھوڑا توقف کرو۔ ہم اپنے معاملات نپٹا لیں اور اپنے بھائیوں کو بتا دیں، پھر چلتے ہیں۔"

"وقت بہت کم ہے۔" وہ سب بیک زبان بولے۔ "عورت دم بہ لب ہے۔ کہیں پہنچنے میں دیر نہ ہو جائے۔ جو واقعی آپ کو ہمارا خیال ہے اور اس مرنے والی کے مہربان، مغرب چاہنے والے ہیں تو فوراً چلیے۔ جگہ زیادہ دور نہیں۔ دوپہر ہوتے ہوتے ہم واپس بھی آ جائیں گے۔"

"اچھا، تو پھر فوراً چل دو۔" پادری نے گرم جوشی سے کہا۔ وہ دونوں گدھوں کی طرف بڑھے باقی لوگ ان کے پیچھے پیچھے آئے۔ ایک گدھے پر اس کو سوار کرایا گیا، دوسرے پر عورت کا شوہر سوار ہوا اور وہ سب تیزی سے روانہ ہو گئے۔

سفر گھنٹوں جاری رہا۔ پادری بار بار پوچھتا رہا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں، اور وہ لوگ گدھے کو ہانکتے ہوئے کہتے رہے: "بس ہم پہنچ گئے"۔ دوپہر کے قریب وہ گاؤں نظر آیا۔ کتوں کے بھونکنے اور لوگوں کے استقبالیہ نعروں کے درمیان وہ داخل ہوئے اور سب جلوس کی شکل میں موضع کی بیٹھک تک آئے۔ پادری کو ایک بڑے سے کمرے میں لے جایا گیا جہاں اس نے ایک عورت کو بستر پر اس طرح پڑے دیکھا کہ اس کی آنکھیں چھت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اس نے عورت کو آواز دی مگر وہ کچھ نہ بولی۔ وہ موت کی دہلیز پر تھی۔ پادری نے اس پر دعائیں پڑھ پڑھ کر دم کرنا شروع کیا۔ ابھی وہ اپنی دعائیں پوری بھی نہیں کر پایا تھا کہ عورت نے ایک طویل گہری سانس لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پادری کو محسوس ہوا کہ بس اب چل چلاؤ ہے۔

مگر جان دینے کے بجائے اس نے پپوٹے پھڑپھڑائے اور نظر ذرا صاف ہوئی تو وہ ہمسائی:

"میں کہاں ہوں؟"

حیرت زدہ ہو کر پادری نے کہا: "اپنے گھر میں۔"

"پانی، پانی دو۔"

گھبرا ڈالے ہوئے رشتےدار چلائے: "پانی لاؤ۔ صراحی لاؤ۔"

فوراً پانی سے بھرا کٹورا لایا گیا جس میں سے عورت نے غٹاغٹ بہت سارا پانی پی ڈالا۔ پھر ڈکار لے کر بولی:

"بڑی بھوک لگی ہے۔ کھانے کو لاؤ۔"

ہر شخص کھانا مہیا کرنے کو دوڑ پڑا۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر ایک نے اس عورت کو کھانے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ اپنے بستر سے اتری اور سارے گھر میں اس طرح ٹہلنے لگی جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ یہ دیکھ کر سب پادری کے سامنے سجدے میں گر پڑے، اس کے ہاتھوں اور پیروں کو چومنے لگے اور کہنے لگے: "اے خدا کے ولی! آپ کے دم قدم سے برکت اس گھر پر نازل ہوئی اور مردہ عورت کو دوبارہ زندگی ملی۔ اس احسان اور عنایت کا شکرانہ ہم کس طرح ادا کریں؟"

"ہم نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا جس کا شکرانہ ادا کیا جائے،" پادری نے جواب دیا۔ وہ اس واقعے سے خود بہت حیران تھا۔ "یہ سب خدا کی قدرت کا کمال ہے۔"

"آپ جو چاہیں نام دیں،" صاحب خانہ نے جواب دیا، "مگر اے خدا کے ولی، یہ بہرحال ایسی کرامت ہے جو آپ کے ہاتھوں انجام پائی۔ آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف لائے۔ آپ کے آنے سے نہ صرف ہماری عزّت بڑھی بلکہ ہم پر خوش بختی بھی نازل ہوئی۔ آپ ہم کو، ہماری بساط بھر، اپنی میزبانی کا شرف بخشیں جو آپ کے شایان شان ہو۔"

اس نے حکم دیا کہ ایک پُرسکون کمرہ مہمان کے لیے آراستہ کیا جائے، اور وہاں اس کو ٹھہرایا۔ پادری نے جب بھی جانے کی بات کی، میزبان نے قسم کھا کر کہا کہ وہ اپنے مقدّس مہمان کو تین دن سے پہلے رخصت نہیں کرے گا: کہ جس بزرگ ہستی نے اس کی بیوی کو دوبارہ زندگی بخشی ہو اس کی میزبانی کم سے کم اسی مدّت تو کی جائے۔ اس عرصے میں اس نے پادری کی بہت خدمت اور تکریم کی۔ جب میزبانی کی میعاد پوری ہوئی تو اس نے ایک سواری تیار کی اور اسے تحائف سے ۔۔دالوں اور مرغیوں اور گھر میں تیار کی ہوئی روٹیوں سے۔۔ لاد دیا، اور ساتھ ہی اس نے پادری کے ہاتھ پر کعبے کے جدے کے طور پر پانچ پونڈ بھی رکھ دیے۔ ابھی وہ اسے گھر سے باہر لے جا کر گدھے پر سوار کرا ہی رہا تھا کہ ایک آدمی ہانپتا کانپتا وہاں پہنچا اور آتے ہی پادری کے قدموں پر گر پڑا۔

"فادر!" وہ لگا گڑگڑانے۔ "آپ کی کرامت کی داستان چاروں طرف پھیل

چکی ہے۔ میرا چچا، جو میرے باپ کی جگہ ہے، موت کی دہلیز پر ہے اور آپ کی دعاؤں کی طلب میں جی رہا ہے۔ خدا اس کی خواہش پوری ہونے تک اس کی روح کو پرواز نہ کرنے دیجیے۔"

"مگر بیٹے، ہم تو اب گھر جانے کو تیار ہیں،" پادری نے بےبسی کے ساتھ کہا۔

"اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں آپ کو جانے نہیں دوں گا جب تک آپ میرے ساتھ چچا کے پاس نہیں چلیں گے۔" اس آدمی نے گدھے کی باگ سنبھال لی اور ہنکا لے چلا۔

"تمھارا یہ چچا کہاں ہے؟" پادری نے دریافت کیا۔

"بالکل قریب — چند منٹ کا فاصلہ ہے۔"

پادری کو اس کی بات ماننے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ وہ ایک گھنٹے تک چلتے رہنے کے بعد اگلے گاؤں میں پہنچے۔ وہاں بھی اس نے پہلے کی طرح ایک مکان میں ایک جان بہ لب بوڑھے کو بستر پر پڑے پایا۔ اس کے اقربا اس کے گرد کھڑے امید وبیم کی حالت میں جھول رہے تھے۔ جیسے ہی پادری نے اس کے پاس جا کر دعائیں پڑھیں کرامت ظہور میں آئی۔ وہ جان بہ لب شخص اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا اور کھانے اور پینے کو مانگنے لگا۔ یہ ماجرا دیکھ کر ہکا بکا رہ جانے والے لوگوں نے اپنی جان سے عزیز چیزوں کی قسم کھا کر کہا کہ اس مقدس ہستی کی میزبانی اب ان پر لازم آتی — وہی پورے تین دن کا قیام۔

میزبانی کے قیام کی یہ مدت پادری نے ان کی پُرتعظیم خدمتوں سے لطف اندوز ہونے میں گزاری۔ مگر جوں ہی وہ پادری کو تحائف سے لاد کر اپنے موضع کے آخری سرے تک پہنچے، ایک اور شخص آ گیا اور اس کو اپنے گاؤں لے جانے پر اصرار کرنے لگا، چاہے تھوڑی ہی دیر کو سہی، کہ اس کو بھی اس مقدس ہستی کی دعائیں مل جائیں جس کی کرامات کی شہرت پورے ضلع میں پھیل چکی تھی۔

پادری اس شخص کی خواہش کی رد سے نہ بچ سکا جو اس کے گدھے کی راس کھینچتا ہوا روانہ ہو گیا اور اسے اپنے گاؤں کے ایک مکان پر لا کھڑا کیا۔ وہاں انھیں ایک نوجوان ملا جو اپاہج تھا۔ ابھی پادری نے اسے چھوا ہی تھا کہ وہ بوڑھوں اور جوانوں کے نعرۂ تحسین میں پورے قد سے دونوں پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ اب تو سب لوگ قسمیں کھا کھا کر اس صاحب

کرامت بستی کی میزبانی کا فرض ادا کرنے پر اصرار کرنے لگے، جو انھوں نے بہت پُرتکلف اور شان دار طور پر، دوسروں کی طرح پورے تین دن اور تین راتوں تک، ادا کیا۔ جب یہ مدت پوری ہوئی تو وہ اپنے مہمان کے پاس بہت سے تحفے لے کر آئے اور پہلے سے موجود تحفوں میں اس قدر اضافہ کر دیا کہ ان کے بوجھ تلے گدھا دوہرا ہو ہو گیا۔ انھوں نے دوسرے گاؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ چندہ پیش کیا، اتنا کہ اب پادری کے پاس تقریباً بیس پونڈ جمع ہو گئے جو اس نے اپنے بٹوے میں رکھے اور اس کو اپنے لباس کے اندر چھپا لیا۔ وہ گدھے پر سوار ہوا اور اس نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ وہ اسے بہ حفاظت چھوڑ آئیں۔ چناں چہ وہ ساتھ ہو لیے اور اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

"ہماری جانیں آپ کا فدیہ۔ ہم اپنے دلوں میں آپ کو چھپا کر رکھیں گے،" انھوں نے کہا۔ "ہم اس وقت تک آپ کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے جب تک بہ حفاظت آپ کو اپنوں میں نہ پہنچا دیں۔ آپ ہمارے لیے اتنے ہی بیش قیمت ہیں جتنا سونا۔"

"ہم تمھیں تکلیف دے رہے ہیں،" پادری نے کہا۔ "مگر کیا کریں، راستا محفوظ نہیں۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے، سارے علاقے میں جتھے گھوم رہے ہیں۔"

"سچ مچ؟" وہ بولے۔ "ان علاقوں میں تو دن دہاڑے بندہ غائب کر دیا جاتا ہے۔"

"سرکار تک ہر طرف پھیلے ہوئے اس شر کو ختم کرنے میں بےبس ہے،" پادری بولا۔ "کہتے ہیں اغوا کرنے والے راستوں میں بسوں کو روک لیتے ہیں اور مسافروں میں سے کسی موٹی سی اسامی کو چھانٹ کر اپنے ساتھ لے جاتے ہیں تاکہ بعد میں اس کے لواحقین سے لمبا تاوان وصول کریں۔ بعض اوقات تو قانون کے محافظوں کی موجودگی میں واردات ہو جاتی ہے۔ میں نے سنا ہے ایک ایسی بس میں جسے ڈاکوؤں نے روکا، دو پولس والے بھی سفر کر رہے تھے۔ جب اغوا کیے جانے والوں نے پولیس والوں سے فریاد کی تو وہ ڈاکوؤں سے اتنے خوف زدہ تھے کہ اغوا ہونے والوں سے کہا بھی تو بس اتنا کہا: چلو اب جاؤ، ہماری جان چھوڑو؟"

وہ لوگ ہنسے اور پادری سے بولے: "آپ بالکل نہ ڈریں۔ جب تک ہم آپ

کے ساتھ ہیں۔ آپ اس گدھے سے اسی وقت اتریں گے جب حفاظت سے اپنے گاؤں پہنچ جائیں گے۔"

"ہم جانتے ہیں تم بہت بہادر ہو! تم لوگوں نے اپنی عقیدت اور خدمت سے ہمیں کافی زیربار کر دیا ہے۔"

"ایسی بات نہ کہیے! آپ ہمارے لیے بہت قیمتی ہیں۔"

اور وہ پادری کے پیچھے پیچھے چلتے رہے، اس کی خوبیاں بیان کرتے اور اس کی کرامات کے گن گاتے رہے۔ وہ ان کی باتیں سنتا رہا اور جو واقعات گزرے تھے ان پر غور کرتا رہا۔ آخرکار اس نے تعجب کے ساتھ کہا: "جو کچھ ان دنوں میں ہمارے ساتھ ہوا وہ یقیناً حیرت انگیز تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ساری کرامات صرف ہماری دعاؤں کے اثر سے ہوئی ہوں؟"

"کیا آپ کو شک ہے؟"

"ہم رسول تو ہیں نہیں کہ جو دنوں میں یہ سب کچھ کر سکیں۔ دراصل یہ تم لوگ ہو جنھوں نے ہم سے یہ کرامات کروا لیں۔"

وہ سب ایک ساتھ بول پڑے: "ہم نے؟ کیا مطلب؟"

"ہاں، تم لوگ ہی حقیقی وسیلہ تھے۔"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟" وہ بڑبڑائے اور آنکھوں آنکھوں میں تک دوسرے کو دیکھا۔

"تمھارا اعتماد ہی تھا،" پادری نے یقین کے ساتھ اپنی بات جاری رکھی۔ "اعتقاد نے ہم سے یہ سب کروا لیا۔ تم اس قوت سے واقف نہیں ہو جو ایمان والوں کے نفس میں چھپی ہوتی ہے۔ اعتقاد ایک قوت ہے مرے بیٹو اعتقاد ایک قوت ہے! کرامات تو تمھارے اپنے دل کی گہرائیوں میں بالکل اسی طرح چھپی ہوئی ہیں جس طرح چٹان کے سینے پانی۔ صرف ایمان و اعتماد کے زور سے ہی یہ سوتے پھوٹ نکلتے ہیں۔" اس نے اسی انداز کی گفتگو جاری رکھی اور اس کے پیچھے چلنے والے اپنے سر ہلاتے رہے۔ اس کا جوش بڑھتا گیا اور وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ وہ لوگ ایک ایک کر کے رفتہ رفتہ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اپنے موسمے کی حدود میں داخل ہونے کے بعد ہی وہ زمین پر واپس آیا اور اپنے محافظوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جب اس نے گردن گھمائی تو خود کو تنہا پا کر حیرت کے مارے اس کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اس کی حیرت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی کیونکہ سامنے اسے اپنا گدھا نظر آ گیا۔ اس کے پادری بھائی، اس کے بڑے، اس کی طرف لپکے، اسے لپٹانے

لگے اس کے ہاتھوں کو چومنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے خوشی کے آنسو نکل نکل کر گالوں پر بہہ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے پادری کو گلے لگاتے ہوئے کہا "آخر آپ صحیح سلامت بھیج گئے! انھوں نے اپنا عہد پورا کر دیا۔ انھوں نے آپ کو لوٹا دیا۔ اب رقم وہ بھلے ہی اپنے پاس رکھیں۔ آپ ہمارے لیے ہر رقم سے زیادہ قیمتی ہیں فادر؟"

پادری نے رقم کا ذکر سنا تو چونک کر پوچھا: "کیسی رقم؟"

"وہ رقم جو ہم نے اس گروہ کو ادا کی۔"

"کون سا گروہ؟"

"وہ جس نے آپ کو اغوا کر لیا تھا۔ اوّل اوّل تو وہ ایک ہزار پونڈ سے کم لینے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ آپ کے دام تو آپ کے ہم وزن سونے کے برابر ہیں۔ ہم نے ان کی منّت سماجت کی کہ آدھی رقم لے لو۔ آخرکار وہ راضی ہو گئے تو ہم نے کلیسا کے فنڈ میں سے پانچ سو پونڈ تاوان ادا کر دیا۔"

"پانچ سو پونڈ؟" پادری چیخا۔ "آپ نے ہمارا تاوان دیا؟ انھوں نے آپ کو بتایا کہ ہمیں اغوا کر لیا گیا ہے؟"

"جی۔ آپ کی روپوشی کے تین دن بعد چند لوگ ہمارے پاس آئے اور بتایا کہ ایک گروہ نے آپ کو اس وقت اغوا کیا جب آپ صبح صبح پام کو پانی دے رہے تھے۔ انھوں نے قسم کھا کر کہا کہ رقم نہ ملی تو آپ کی جان کی خیر نہیں۔ اگر تاوان ادا کر دیا گیا تو آپ زندہ سلامت یہاں پہنچا دیے جائیں گے۔"

جو کچھ اس پر بیتی تھی اس کو دھیان میں لاتے ہوئے پادری نے ان کی باتوں پر غور کیا۔

"بےشک سب عیاں ہو گیا؟" اس نے یوں کہا جیسے خود سے مخاطب ہو۔ "وہ مُردے، وہ بیمار اور وہ اپاہج جو میری دعاؤں سے اچھلنے کودنے لگے۔ کیا کمال مہارت تھی؟"

اس کے بھائی بند اس کے قریب آ آ کر اس کے بدن اور لباس کا معائنہ کرنے لگے اور خوش ہو کر بولے: "آپ کی سلامتی سے بڑھ کر کوئی چیز اہم نہیں فادر! ہمیں امید ہے قید کے دوران انھوں نے آپ سے کوئی بدسلوکی نہیں کی ہو گی۔ وہ کس طرح پیش آئے؟"

حیرت میں ڈوبے ڈوبے اس نے جواب دیا۔

Scanned with CamScanner

"انھوں نے ہم سے کرامات کروائیں -- ایسی کرامات جو کلیسا کو بہت مہنگی پڑیں"

Scanned with CamScanner

عبدالسّلام العُجیلی

انگریزی سے ترجمہ : عطا صدیقی

حواب

تم دیکھو کہ اللہ کے دین میں فوج فوج داخل ہوئے ہیں تو اپنے رب کی ثنا کرتے ہوئے اس کی تحمید کرو اور اس سے بخشش طلب کرو۔ بےشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ صدق اللہ العلی العظیم۔" شیخ محمد سعید نے کہا: "محمد ویس، اپنے رب کی حمدوثنا کرو اور اس سے استغفار کی درخواست کرو۔ بےشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

"یاشیخ، میرا دل کہتا ہے یہ میرے لیے نیک شگون ہو گا۔ آپ اس خواب کی تعبیر میں کیا کہتے ہیں؟"

شیخ محمد سعید نے اپنی چوڑی اور گھنی داڑھی کو مٹھی میں تھام لیا اور انگلیوں سے بالوں میں خلال کرنے لگے۔ وہ اپنے تبحر کو خواب کی تعبیر جیسی معمولی بات کے لیے استعمال کرنے سے ہچکچا رہا تھا۔ آخرکار وہ بولا: "محمد ویس، اللہ سے توبہ استغفار کرو۔ بےشک وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ خواب میں خود کو یہ سورت پڑھتے ہوئے دیکھنے کا مطلب ہے کہ بس، اب انجام قریب ہے۔"

محمد ویس جو ویسے ہی بولایا بولایا سا رہتا تھا، یہ سنتے ہی سر سے پیر تک لرز گیا۔

"کیا کہہ رہے ہیں شیخ؟"

"تمھارے روبرو یہ بات کہتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے،" شیخ بولا۔ "مگر حوصلہ رکھو، اللہ کی رحمت جلد ہی تمھارے شامل حال ہو گی۔ اور موت تو سبھی کو آنی ہے۔ محمد ویس کوئی شخص یہ خواب دیکھنے کے بعد چالیس دن سے زیادہ نہیں جیتا۔"

یہ فیصلہ سنا کر شیخ تو ظہر کی نماز کے لیے وضو کرنے چل دیا اور محمد ویس مارے دہشت کے گم سم بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ اس کے پیروں میں کھڑے ہونے کی سکت تک نہ رہی۔

خشک گلے سے وہ منمنایا، "چالیس دن! اللہ رحمت دے۔"

جس بستی میں محمد ویس اور شیخ محمد سعید رہتے تھے بہت مختصر سی تھی، اس لیے شام ہوتے ہوتے ہر فرد کو محمد ویس کے خواب اور شیخ محمد سعید کی تعبیر کا علم ہو گیا۔ وہ موضع ایسا تھا جہاں خوابوں کی تعبیر پر اعتبار کیا جاتا تھا اور اگلی شام تک ہر فردوبشر کو یقین ہو چلا تھا کہ محمد ویس چالیس دن میں ختم ہو جائے گا۔ پہلے فرداً فرداً اور پھر [illegible]وں میں لوگ [illegible] محمد ویس سے ملنے لگے جس کے

ساعت ان لوگوں کی خاطر جو اس کی عیادت یا پیش از مرگ تعزیت کے لیے آ رہے تھے اس کو اپنے گھر ہی پر رہنا پڑا۔ محمد ویس کے خاندان کی عورتیں ٹوہ لینے کے لیے آتیں اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا جائزہ لیتیں۔ اس کو تندرست اور توانا مگر خیالوں میں گم دیکھ کر وہ سی کرنے لگتیں اور اللہ سے فریاد کرتیں کہ موت کے فرشتے کو روک لے جو اس کو لے جانے پر تُلا ہوا تھا حالاں کہ وہ ابھی ہٹا کٹا تھا۔ گو محمد ویس کو کوئی غم یا تردّد نہیں تھا، لیکن حفظِ ماتقدّم کے طور پر جو تدبیریں ہو رہی تھیں اور اس سلسلے میں جو نازک سوالات اس سے کیے جا رہے تھے انھوں نے اس کو اندوہ اور پریشانی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ دس دن تو اس نے جیسے تیسے معمول کے مطابق گزار لیے، گھر سے ہاٹ تک روزانہ آتاجاتا رہا، تاہم جلد ہی اس کے اعصاب بول گئے اور قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ اب لوگوں نے دن میں بھی اس کے پاس آنا شروع کر دیا تھا، جبکہ پہلے وہ صرف شام ہی کو گھر پر ملتا تھا۔ خواب دیکھنے کے بیس دن بعد محمد ویس کے گھر کی عورتوں نے اس کا بستر جھاڑنا چھوڑ دیا کیوں کہ اب وہ صبح شام اسی پر پڑا رہتا تھا۔ جب میعاد کے بیس دن نکل گئے تو تمام کھانے جو اس کو مرغوب تھے اور جو اس کے گھر والے بنا بنا کر پیش کیا کرتے تھے، اب بےچھوئے اس کی چاروں طرف رکھے رہتے۔ اس نے داڑھی چھوڑ دی اور ایک سفید سا لبادہ پہنے ہر وقت عبادات میں مشغول رہنے لگا۔ اس پر ہمہ وقت رقت طاری رہتی، نہ موت کے خوف سے اور نہ زندگی کے ختم ہونے کے غم میں، بلکہ ان سزاؤں کی ہیبت سے جو قبر سے آگے اس کے انتظار میں تھیں۔ اسے خوف اس بات کا تھا کہ اس نے کاروبار کے دوران اللہ کی بڑی چھوٹی قسمیں کھائی تھیں اور ہاٹ میں آس پاس کے دیہاتیوں کو بڑے دھوکے دیے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ ان خطاؤں کو معاف نہ کرے۔ جوں جوں دن گزرتے گئے اور چالیسواں دن قریب آتا گیا، اس کے خالی پیٹ پر جمی ہوئی چربی ان پچھلے گناہوں کی توبہ استغفار میں گھلتی چلی گئی۔ اس کی بستی اور اس پاس کی بستیوں کے لوگ اب اس کے چہرے کے گرد ایک نورانی ہالے کا ذکر کرنے لگے اور ایسے پُراسرار کلمات کا چرچا ہونے لگا جو نماز پڑھتے ہوئے اس کی زبان سے ادا ہوتے تھے۔ چالیس میں سے جب اڑتیس دن گزر چکے تو انتالیسویں دن مَیں وہاں پہنچا۔

آپ پوچھیں گے کہ مَیں کون ہوں؟

جس موسم میں محمد ویس مویشیوں کا دلاّل تھا اور شیخ محمد سعید ولی اللہ سمجھا جاتا تھا، مَیں وہاں کے اسکول میں مدرّس تھا۔ میں گرمیوں کی تعطیلات دمشق میں گزارتا تھا جہاں سے میری واپسی محمد ویس کے لیے شیخ محمد سعید کے مقرر کیے ہوئے چالیس دنوں میں سے اکتالیسویں دن ہوئی۔ میں محمد ویس سے بھی اسی طرح واقف ہوں جیسے بستی کے دوسرے لوگوں سے۔ تو جب اسکول کے بوڑھے چوکیدار عطاءاللہ نے مجھے اس کا قصہ سنایا تو میں یہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ اس کی حالت پر اپنا سر پیٹ لوں یا قہقہے لگاؤں۔ اس لیے میں عطاءاللہ کو ساتھ لے کر اس کی عیادت کرنے ... آنے والی موت پر تعزیت کرنے۔ گیا۔ وہ احاطہ جو محمد ویس کے خریدے ہوئے مویشیوں سے بھرا ہوتا تھا، اس وقت ان تمام لوگوں سے بھرا ہوا تھا جو اس کی قریب آتی ہوئی متوقع موت کے انتظار میں جمع ہو گئے تھے۔ ایک کونے میں مرد جمع تھے تو دوسرے گوشے میں عورتیں، اور تیسری طرف وہ بھیڑبکریاں بندھی ہوئی تھیں جو محمد ویس کے دوست احباب اس کی زندگی ہی میں اس لیے لے آئے تھے کہ اس کی الوداعی رات کو ذبح کی جائیں۔ جس کمرے میں محمد ویس ملک الموت کا انتظار کر رہا تھا وہاں داخل ہونے پر میں نے اسے دیکھا — ملک الموت کو نہیں، محمد ویس کو — وہ اپنے بستر کے ایک کونے پر ٹکا عبادت میں مشغول تھا جبکہ دوسرے کونے میں شیخ محمد سعید بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کر رہا تھا۔ جس محمد ویس کو میں جانتا تھا اس کی بالکل مختلف صورت دیکھ کر مجھے دھچکا لگا۔ اس کا گول گلگوں چہرہ اب ستواں اور پیلا ہو گیا تھا اور داڑھی نے اسے اور بھی لمبوترا سا بنا دیا تھا۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے سفید لباس نے اس کے چہرے کی زردی کو اور نمایاں کر دیا تھا۔ نماز پڑھتے ہوئے وہ اپنے سجدوں کو اس امید میں طویل کر دیتا کہ موت آئے تو سجدے میں آئے۔ اس ولی اللہ میں اور اُس محمد ویس میں زمین آسمان کا فرق تھا جس کو میں اپنی کھڑکی میں سے قسمیں کھا کھا کر یہ کہتے سنا کرتا تھا کہ اگر اس نے ابھی ابھی خریدے ہوئے جانور پر تین لیرے کا گھاٹا نہ اٹھایا ہو تو سمجھو اپنی بیوی کو طلاق دی۔ میں محمد ویس سے ملنے تو اپنے شوق اور تجسس میں گیا تھا لیکن اس کی حالت میں یہ فرق دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور اس بات کا یقین ہو گیا کہ وہ یقیناً وقت معین پر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اور جب میں نے شیخ محمد سعید کو کنکھیوں سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے

پایا تو میرے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔

میری اس شیخ سے، جس کی فطرت سادگی حماقت اور مکّاری کا مجموعہ تھی، کافی عرصے سے مخاصمت چلی آ رہی تھی۔ میں اس کی عطائیت اور دعا سے، جن کے زور پر اس نے جاہل دیہاتیوں کے ذہنوں کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا، ہمیشہ لڑا کرتا تھا اور وہ بھی ان کو میرے خلاف ورغلانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ مجھ پر الزام لگاتا کہ میں بچّوں کے ذہنوں کو ملحدانہ خیالات سے مسموم کرتا ہوں اور انہیں اللہ رسول کا باغی بناتا ہوں۔ میری مخالفت میں اس کا جوش یہ جاننے کے باوجود کم نہیں ہوتا تھا کہ میں رسول کے پرنواسے حضرت زین العابدین کی اولاد میں سے ہوں، بلکہ وہ اسی کو میری مذمّت کا جواز بنا لیتا تھا۔ "اس شخص کو دیکھو، حضرت زین العابدین کی اولاد ہو کر کہتا پھرتا کہ زمین گھومتی ہے۔" پھر وہ لوگوں سے کہتا، "بھلا بتاؤ، تم میں سے کسی نے کبھی اپنے گھر کے مشرقی رخ کے دروازے کو اچانک مغرب کی طرف گھومتے دیکھا؟"

جیسا کہ میں نے بتایا، شیخ محمد سعید کو دیکھ کر مجھے غصّہ آ گیا تھا اور میں چیخ پڑنے کو تھا کہ وہ قاتل ہے، وہ محمد ویس کے ذہن میں وہ زہر بھر رہا ہے جو اس کو چالیس دن میں مار ڈالے گا۔ تاہم میں نے ضبط سے کام لیا۔ اس طرح بگڑ کر میں شیخ کے خلاف کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، کیوں‌کہ وہ ہمیشہ کی طرح اسی زمین کی گردش والی دلیل سے ثابت کر دیتا کہ کس دیہاتی نے اپنا مشرقی رخ والا دروازہ مغرب کی جانب گھومتے دیکھا ہے؛ پس ثابت ہوا کہ زمین نہیں گھومتی۔ میرے خلاف کینہ رکھنے پر اللہ اس پر رحم کرے، اور محمد ویس اگر کل صبح تک شیخ محمد سعید کے زیراثر رہے تو اللہ اس پر بھی رحم کرے۔ غم اور غصّے کے مارے دل پر ایک بوجھ لیے میں اسکول لوٹ آیا۔

میرے کہنے کے مطابق چوکیدار عطااللہ نے مجھے منھ اندھیرے اٹھا دیا۔ میں اپنے ساتھ دمشق سے تین چتّی دار ناشپاتیاں لایا تھا جو میں نے رات کو ہوا کے رخ پر رکھے مٹکے کے نیچے رکھ دی تھیں۔ ان میں سے ایک ناشپاتی اٹھا کر میں لپکا ہوا محمد ویس کے گھر پہنچا۔ سوائے ان بھیڑبکریوں کے جو اپنے مالک کی موت کے نتیجے میں خود اپنی موت کی منتظر کھڑی تھیں، احاطے میں کوئی نہیں تھا۔ زنان خانہ روشن تھا اور رونے کی دھیمی دھیمی

اوار آ رہی تھی۔ محمد ویس کا کمرہ بند تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکا تو دیکھا کہ وہ موت کے انتظار میں عبادت کرتے کرتے تھک کر سویا پڑا ہے۔ کئی بار میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا، پھر دھکا دے کر دروازہ کھولتے ہوئے چلّا کر کہا:

"محمد ویس، اللہ کی حمدوثنا کرو!"

وہ نیند سے چونک پڑا اور چیخا: "کیا ہوا؟"

"میں ہوں استاد ناجی۔ ڈرو نہیں، محمد ویس، اور میری بات سنو۔"

میں نے دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے تھے اور بہہ بہہ کر اس کے رخساروں سے ٹپک رہے تھے اور وہ سہما ہوا گم سم بیٹھا تھا۔ اس خوف سے کہ کہیں میری بات سننے سے پہلے ہی اس کا دم نہ نکل جائے، میں نے کہا:

"میں تمھارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ میرے جدامجد حضرت زین العابدین نے مجھے سردار کر کے تمھارے پاس بھیجا ہے۔ آپ پر اللہ کی رحمت ہو۔ آپ نے مجھے حکم دیا: محمد ویس کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ اللہ نے اس کو آزمائش میں ڈالا تھا اور جان لیا کہ وہ توبہ کرنے والا بندہ ہے۔ اس کو یہ پھل دینا یہ بہشت کے میووں میں سے ہے، اور حکم دینا کہ سورج طلوع ہونے سے پہلے دو رکعت نماز تمھارے ساتھ ادا کرے اور پہلی رکعت میں سورۂ نصر پڑھے۔ اللہ اس کی عمر اتنی دراز کرے گا کہ وہ نہ صرف اپنے بچوں کی بلکہ بچّوں کے بچّوں کی خوشیاں بھی دیکھے گا۔"

محمد ویس نے تھوک نگلا۔ یوں دکھائی دیا جیسے میری بات پوری طرح اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ بس میرے ہاتھ میں دبی ہوئی دشپاتی کو گھورتا رہا۔ (مجھے یقین تھا کہ بستی میں کسی نے بھی چینی دار دشپاتی نہیں دیکھی تھی۔) میں نے دشپاتی چھیل کر اس کو کھلائی اور بیج سمیت نگل جانے کو کہا۔ پھر میں اسے کھینچ کر کمرے کے کونے میں لے گیا۔

"محمد ویس، سورج نکلنے سے پہلے نماز کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

"مگر استاد ناجی، میں وضو سے نہیں ہوں۔"

مجھے یاد آیا کہ میں نے بھی وضو نہیں کیا تھا، مگر اس خوف سے کہ کہیں میرے مشورے کا اثر زائل نہ ہو جائے، میں نے سمجھایا:

"تیمم کر لو محمد ویس، اس کی اجازت ہے۔ مارو ہاتھ زمین پر۔"

محمد ویس کے ساتھ کھڑے ہو کر میں نے بھی نماز پڑھی۔ ہم نے دو

رکعت نماز ادا کی اور پہلی رکعت میں اس نے سورۂ نصر پڑھی۔ پھر میں لوٹ کر اسکول آ گیا اور صبح کا انتظار کرنے لگا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر پوری بستی کو محمد ویس کی نئی بشارت کا علم ہو گیا۔ وہ تمام لوگ جو کل محمد ویس کے احاطے میں جمع تھے آج اسکول کے احاطے میں جمع ہو گئے۔ اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کہ آیا واقعی میرے جدامجد حضرت زین العابدین خود میرے پاس محمد ویس کی بریت لے کر آئے تھے، وہ سب ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ اس وقت مجھے لگا کہ آج میں نے شیخ محمد سعید پر واضح فتح حاصل کر لی، کیونکہ نہ تو محمد ویس مرا اور نہ اس کی بھیڑبکریاں ذبح ہوئیں بلکہ وہ سب حضرت زین العابدین کی اولاد، ولی اللہ استاد ناجی کی، یعنی میری نذر کر دی گئیں۔

مگر کیا یہ واقعی میری فتح تھی؟ سچ بات یہ ہے کہ مجھے اس کا یقین نہیں۔ اس فتح کی حقیقت پر شک کا سبب یہ ہے کہ میں شیخ محمد سعید کے مقتدیوں میں سے ایک بھی کم نہ کر سکا، بلکہ الٹا میں نے ان میں ایک کا اضافہ ہی کر دیا، یعنی اسکول کے مدرّس کا، یعنی خود اپنا۔ اپنے جدامجد کے ناموس کو قائم رکھنے کی خاطر، جن کے نام سے میں نے اپنا جواب گھڑا تھا، اب میں بھی شیخ محمد سعید کے پیچھے نماز پڑھنے پر مجبور ہوں، تیمّم کر کے نہیں، باقاعدہ وضو کر کے۔

زکریا تامر

انگریزی سے ترجمہ : عطا صدیقی

دسویں دن کے شیر

پنجرے میں بند شیر سے جنگل بہت دوردراز کے فاصلے پر رہ گئے تھے مگر وہ ان کو بھول نہیں پایا تھا۔ پنجرے کے چاروں طرف جمع لوگوں کو وہ غصے سے گھور رہا تھا اور وہ اس سے خوف کھائے بغیر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ان لوگوں میں سے ایک پُرسکون لیکن پُرتحکم آواز والا شخص باقی لوگوں سے کہتا ہے: "اگر تم واقعی چاہتے ہو کہ میرا پیشہ، یعنی سدھانے کا پیشہ اختیار کرو تو کسی بھی وقت تم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تمہارا پہلا نشانہ مدمقابل کا پیٹ ہو۔ اور تم دیکھ لو گے کہ یہ پیشہ بیک وقت مشکل بھی ہے اور آسان بھی۔

"اس شیر کو دیکھو۔ یہ ایک خوفناک اور خودسر شیر ہے۔ اس کو اپنی ارادی اپنی صاف اور اپنی بےجگری پر بڑا ناز ہے۔ مگر یہ بدل جائے گا اور معصوم بچے کی مانند بڑا شریف، نرم خُو اور فرمانبردار بن جائے گا۔ جس کے پاس کھانا ہے اور جس کے پاس کھانے کو نہیں، ان دونوں کے مابین کیا ہوتا ہے، اب دیکھنا اور سیکھنا۔"

ان لوگوں سے فوراً ہی جواب دیا کہ وہ دل لگا کر سدھانے کا کام

سیکھیں گے اور سدھانے والا خوش ہو کر مسکرایا اور شیر سے مخاطب ہو کر طنزیہ انداز میں پوچھنے لگا: "اور ہمارا پیارا مہمان کس حال میں ہے؟"

شیر بولا "کھانا لاؤ۔ اب میرے کھانے کا وقت ہے۔"

بناوٹی حیرت سے سدھانے والا بولا "تم مجھ پر حکم چلا رہے ہو جب کہ تم میرے قیدی ہو؟ خوب، دلچسپ شیر ہو تم۔ اب تم کو جان لینا چاہیے کہ یہاں صرف مجھے حکم چلانے کا حق ہے۔"

"شیر کو کوئی حکم نہیں دیتا۔" شیر نے جواب دیا۔

"مگر اب تم شیر کہاں ہو؟" سدھانے والے نے کہا۔ "جنگل میں رہے ہو گے، پر اب تو تم پنجرے میں ہو۔ اب تم غلام ہو جو صرف حکم مانتے ہیں اور جو میں کہوں وہ کرتے ہیں۔"

"میں کسی کا غلام نہیں بنوں گا۔" شیر نے طیش میں آ کر کہا۔

"تم میرا حکم ماننے پر مجبور ہو۔ کھانا تو میرے پاس ہے۔" سدھانے والے نے کہا۔

شیر بولا: "نہیں چاہیے مجھے تمھارا کھانا۔"

"تمھاری مرضی، تو رہو بھوکے۔" سدھانے والے نے کہا۔ "میں تمھاری مرضی کے خلاف تمھیں کچھ کرنے پر مجبور نہیں کروں گا۔" اور اپنے شاگردوں سے بولا "دیکھنا کیسا بدلتا ہے۔ اکڑ میں تنا ہوا سر بھوک نہیں مٹا سکتا۔"

شیر بھوکا رہا اور ان دنوں کی ہُوک میں اداس رہا جب وہ آزادی سے آندھی طوفان کے مانند اپنے شکار کے لیے جدھر جی چاہتا جھپٹ سکتا تھا۔

دوسرے دن سدھانے والا اور اس کے شاگرد شیر کے پنجرے کے گرد جمع ہوئے تو سدھانے والے نے کہا: "بھوک نہیں لگ رہی؟ بےشک تمھاری بھوک اب تمھارے لیے تکلیف اور اذیت کا سبب ہے۔ کہہ دو کہ تم بھوکے ہو اور جو سا گوشت تم کہو گے تم کو مل جائے گا۔"

شیر کچھ نہ بولا تو سدھانے والے نے کہا: "بےوقوف مت بنو۔ جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ بس مان لو کہ تم بھوکے ہو، اور فوراً ہی پیٹ بھر کر کھاؤ۔"

شیر نے کہا: "میں بھوکا ہوں۔"

سدھانے والا ہنسا اور اس نے اپنے شاگردوں کو بتایا: "دیکھو، اب یہ

سکے تو میں آگے بھی نہ نکل نہیں سکتا۔"

اس نے حکم دیا اور شیر کو بہت سا گوشت کھانے کو دے دیا گیا۔

دوسرے دن سدھانے والے نے آکر شیر سے کہا "آج بھی کھانا چاہتے ہو تو جو میں کہوں وہ کرو۔"

"میں تمہارا حکم نہیں مانوں گا۔" شیر نے جواب دیا۔

"اتنی ضد مت کرو۔ میں جو چاہتا ہوں وہ بہت ہی معمولی سی بات ہے۔ تم اس وقت پنجرے میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہے ہو۔ جب میں کہوں کہ رک جاؤ تو بس تم رک جانا۔"

یہ تو بہت معمولی سی درخواست ہے۔ شیر نے دل میں کہا۔ ایسی بھی نہیں کہ میں اس پر اڑ جاؤں اور بھوکا مروں۔

بہت درشت اور تحکمانہ لہجے میں سدھانے والا چلایا "رک جاؤ!"

شیر فوراً ہی منجمد ہو گیا اور سدھانے والے نے خوش ہو کر کہا "شاباش!"

شیر بھی خوش تھا۔ اس نے بدندوں کی طرح کھانا کھایا۔ اس کے بعد سدھانے والے نے اپنے شاگردوں سے کہا: "کچھ دنوں کی بات ہے یہ کاغذی شیر بن جائے گا۔"

چوتھے دن شیر نے سدھانے والے سے کہا: "بھوک لگ رہی ہے۔ مجھ سے رک جاؤ کہو۔"

سدھانے والا اپنے شاگردوں سے بولا: "اب یہ میرے حکم پسند کرنے لگا ہے۔" پھر اس نے شیر سے کہا: "آج تم کھانا اس وقت تک نہیں کھاؤ گے جب تک تم بلی کی طرح میاؤں میاؤں نہیں کرتے۔"

شیر نے غصے کو قابو میں رکھا اور دل میں کہا بلی کی نقل کر کے تو میں اپنا ہی دل بہلاؤں گا۔

اس نے فوراً ہی بلی کی نقل میں میاؤں میاؤں کیا مگر سدھانے والے نے تیوری چڑھائی اور بگڑ کر بولا "تمہاری نقل بالکل اچھی نہیں۔ تمہاری میاؤں میں بلی کی آواز کم دہاڑنے سے ملتی جلتی ہوئی ہے؟"

چنانچہ شیر نے پھر سے بلی کی نقل کی مگر سدھانے والے نے ناپسندیدگی کا اظہار جاری رکھا اور حقارت سے بولا "چپ ہو جاؤ۔ تمہاری نقل اب بھی بالکل ردی ہے۔ آج تمہیں مشق کا موقع دیا جاتا ہے۔ کل امتحان ہوگا۔ اگر تم کامیاب ہوئے تو کھانا ملے گا ورنہ بھوکے رہنا۔"

Scanned with CamScanner

سدھانے والا پنجرے کے پاس سے اپنے شاگردوں کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ وہ سب آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور ہنس رہے تھے۔ شیر نے دہاڑ کر جنگلوں کو یاد کیا مگر وہ بہت دور تھے۔

پانچویں دن سدھانے والے نے شیر سے کہا: "چلو اگر آج تم نے ٹھیک ٹھیک میاؤں میاؤں کر لیا تو تازہ گوشت کا بہت بڑا پارچہ ملے گا۔"

شیر نے بلّی کی نقل کی اور سدھانے والے نے خوشی کے اظہار میں تالیاں بجائیں اور بولا: "تم عظیم ہو! تم نے تو بالکل اس طرح میاؤں میاؤں کیا جیسے بلّیاں جاڑوں میں کیا کرتی ہیں۔" اور اس نے گوشت کا ایک بڑا سا ٹکڑا اس کی طرف اچھال دیا۔

چھٹے دن جوں ہی سدھانے والا شیر کے پنجرے کے سامنے پہنچا، شیر نے بلّی کی طرح میاؤں میاؤں کرنا شروع کر دیا۔ مگر سدھانے والا بالکل چپ رہا اور اپنی تیوریاں چڑھائے رکھیں۔

"دیکھا میں نے میاؤں میاؤں کیا،" شیر نے کہا۔

"گدھے کے رینکنے کی نقل کرو،" سدھانے والا بولا۔

"میں جس سے جنگل کے سارے جانور خوف زدہ رہتے ہیں، شیر ہو کر گدھے کی نقل کروں؟" شیر نے برہمی سے کہا۔ "ایسا کرنے کے بجائے مر جانا بہتر ہے۔"

سدھانے والا کچھ کہے سنے بغیر پنجرے کے پاس سے ٹل گیا۔

ساتویں دن وہ مسکراتا ہوا شیر کے پنجرے کے قریب آیا اور شیر سے بولا: "کیوں بھئی، کھانا نہیں چاہیے؟"

"کیوں نہیں؟ چاہیے کھانا،" شیر نے جواب دیا۔

سدھانے والے نے کہا: "جو گوشت تمھیں ملے گا اس کی کچھ قیمت ہے۔ گدھے کی طرح رینکو گے تو کھانا ملے گا۔"

شیر نے جنگل کو دھیان میں لانے کی کوشش کی، مگر ناکام رہا تو آنکھیں بند کر کے رینکنے لگا۔

"تمھارا رینکنا بالکل بُرا ہے،" سدھانے والے نے بتایا، "مگر خیر، تم پر رحم کھا کر میں تمھیں ایک ٹکڑا گوشت کا دیے دیتا ہوں۔"

آٹھویں دن سدھانے والے نے شیر سے کہا: "میں تقریر کرنے جا رہا ہوں۔ جب وہ ختم ہو تو تم تالیاں بجانا۔"

پھر سدھانے والے نے تقریر کی: "ہم وطنو، ہم نے پہلے بھی متعدد مواقع

ہو ان معاملات پر جو ہمارے مستقبل سے متعلق ہیں، اپنے موقف کی وضاحت کی ہے۔ ہماری مخالف قوتیں جتنی سازشیں چاہیں کر لیں، مگر ہم اپنے اس پُرعزم اور دوٹوک موقف سے سرمو انحراف نہیں کریں گے۔ بس محکم ہی سے ہم فتح یاب ہوں گے۔"

"میں تمھاری بات نہیں سمجھا،" شیر نے کہا۔

"تمھارا کام بس یہ ہے کہ جو کہا جائے اس کی تعریف کرو اور تالیاں بجاؤ،" سدھانے والے نے کہا۔

"معاف کرنا،" شیر بولا، "میں تو جاہل اور ناخواندہ ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا وہ مجھے عجیب سا لگا۔ اگر تمھاری خواہش یہی ہے تو میں ضرور تالیاں بجاؤں گا۔" شیر نے تالیاں بجائیں اور سدھانے والے نے کہا، "مجھے یہ منافق پسند نہیں، یہ منافقت سزا میں آج تمھیں کچھ نہیں ملے گا۔"

تیسرے دن سدھانے والا گھاس کا ایک گٹھا لے کر آیا اور شیر کے سامنے ڈال کر بولا، "لو، کھاؤ۔"

"کیا؟ یہ کھاؤں؟" شیر بولا، "میں تو درندہ ہوں۔"

سدھانے والے نے کہا، "آج کے بعد سے تم گھاس کے سوا کچھ نہیں کھاؤ گے۔"

بھوک جب برداشت سے باہر ہو گئی تو شیر نے گھاس ہی کھانے کی کوشش کی، مگر اس کا مزہ اس کو بُرا لگا تو وہ مارے حقارت کے الگ ہٹ گیا۔ تاہم وہ باربار پلٹ کر آیا اور رفتہ رفتہ اس کو مزہ اچھا لگنے لگا۔

دسویں دن نہ سدھانے والا تھا، نہ اس کے شاگرد، نہ شیر تھا نہ اس کا پنجرہ۔ شیر شہری بن گیا اور پنجرہ شہر۔

محمد برادا

انگریزی سے ترجمہ : عطا صدیقی

قسطوں میں حیات

ہم دیر سے جاگے اور بستر میں پڑے پڑے جماہیاں لیتے رہے۔ یوں لگتا تھا جیسے ہڈیوں کے جوڑ جوڑ الگ ہو جائیں گے۔ یہ نظر آ رہا تھا کہ آج کا دن بھی پچھلے گزرے ہوئے دنوں ہی کی طرح گزرے گا۔ ہم نے اپنا سر چوبی سرہانے پر ٹکا دیا۔ ہماری نظر دھندلی دھندلی ہو رہی تھی اور بلاشبہ ہمارا چہرہ بھی پیلا پڑا ہوا تھا۔ ہم ڈاکٹر سے اس سلسلے میں رجوع کر چکے تھے۔ اس سے اپنی شکایت کہی تھی جس پر اس نے سیانوں کی طرح سر ہلا کر کہا تھا،

"تم اکیلے نہیں ہو ۔۔ تمھاری طرح کے وہ تمام افراد جو غور وفکر میں مبتلا رہتے ہیں اور خواب دیکھتے رہتے ہیں اور حال سے مطمئن نہیں ہوتے، اسی مرض کا شکار ہوتے ہیں۔"

ہمیں یاد آیا ایسا ہی جواب کسی ڈاکٹر نے ۔ غالباً ہمارے ہی ڈاکٹر نے۔۔ ہمارے ایک دوست کو بھی دیا تھا جو اس کے پاس بدہضمی اور سینے کی جلن کی شکایت لے کر گیا تھا۔

"کوئی علاج بھی ہے ڈاکٹر؟"

"میں تم کو چند گولیاں دیے دیتا ہوں جن سے تمھیں افاقہ ہو گا۔ لیکن

Scanned with CamScanner

زیادہ خوش فہمی میں مت پڑنا۔ ہر صبح جیسے ہی آنکھ کھلے، ذہن پر زور دے کر کوئی ایسا دلچسپ قصّہ یاد کرنا جس سے تم باچھیں پھاڑ کر مسکرا سکو، اور پھر بستر سے کودنا اور بلند آواز سے گانا۔ ایسے موقعے پر بےسُری آواز بھی چلے گی۔"

ہم نے ڈاکٹر کے مشورے پر عمل کرنے کے ارادے سے اپنی یادداشت کے کونے کھدروں میں کسی ایسے قصّے کو تلاشا جو ہمیں ایک دم لوٹ پوٹ ہو جانے پر مجبور کر دے۔ ہماری ایک ولایتی پڑوسن اکثروبیشتر خوش وقتی کے لیے ٹیکسی پکڑ لیتی تھی، حالاں‌کہ خود اس کے پاس کار تھی۔ سیرسپاٹے کے بعد جب ٹیکسی بلڈنگ کے دروازے پر رکتی تو وہ یہ ظاہر کرتی کہ پیسے تو گھر ہی پر رہ گئے۔ پھر وہ اتر کر پیسے لینے بلڈنگ میں چلی جاتی اور اوپر جا کر غائب ہو جاتی، اور وہ بےچارہ ٹیکسی والا ہارن بجاتا رہتا۔ بلڈنگ والے جھانک جھانک کر دیکھتے کہ اسے کیا ہو گیا۔ عورت کا گھر معلوم نہ ہونے کی وجہ سے وہ ناپتا رہ جاتا اور تھک کر چل دیتا۔ اور وہ عورت اپنے کمرے میں ہنس ہنس کر دوہری ہو جاتی۔ ہی ہی ہی ہی! ہاہاہاہا! اس قصّے کا یاد آنا تھا کہ ہم خوب ہی ہنسے اور دل ہی دل میں اپنی اس ہوشیار پڑوسن کے ممنون ہوئے۔ پھر ہم اپنے بستر سے کودے اور گاتے ہوئے اپنی طویل تعطیل کا ایک نیا دن شروع کیا۔

اپنے بھرےپُرے کتب خانے میں ہم دیر تک بےمقصد ٹہلتے رہے۔ ہم نے دیکھا کہ اس میں بیشتر کتابیں وہ ہیں جنھیں ہم نے بعد کے لیے اٹھا رکھا تھا کہ جب فرصت ملے گی تو ان کا مطالعہ کیا جائے گا۔ ہمارا ہاتھ ایک سرخ جلد کی طرف بڑھ گیا جس کا مصنّف چالیس برس قبل مراکش کے مدینۃ الاحمر میں رہتا تھا۔ وہ کتاب محمد ابن عبداللہ المعقّط کی "سفرنامۂ مراکش عرف افعالِ شنیعہ کا عصری عکس المعروف بہ تارکِ سنّت کے خلاف تیغ بےنیام" تھی۔

۔۔۔پھر شیخ عبدالہادی نے ارشاد کیا، "جس نے سوال کیا اور جس سے سوال کیا گیا، ہر دو فرد دسویں صدی کے لوگوں میں سے تھے۔ اب ذرا ہمارے اس زمانے کو قیاس کرو، جو مثل ایک طویل شبِ مظلمہ کے ہے، کہ بات کہیں نہ بڑھ چکی ہو گی! سردارانِ قوم کو لو تو انھوں نے رعیّت کو ظلم کے سوا کیا دیا؟ گوشت انھوں نے نوچ لیا اور خون پی [illegible] ہڈیوں کا گودا تک وہ چُوس گئے اور دماغ چٹ کر گئے اور رعیّت کے لیے نہ دیا۔ چھوڑی نہ

Scanned with CamScanner

دنیں۔ متاعِ دنیا کو لو تو انھوں نے سب کچھ سمیٹ لیا، کچھ نہ چھوڑا، اور دین کی پوچھو تو ان کا منھ اس سے موڑا۔ یہ سب ہمارے مشاہدے کی باتیں ہیں، فقط باتیں ہی باتیں نہیں۔۔۔"

انورید نے سوال کیا: "اللہ آپ کو توفیق دے، کیا ایسے دیار میں قیام کرنا جائز ہے جہاں کوئی منکرات کی نہی کرنے پر قادر نہ ہو؟"

ذہن کو مطالعے سے کوئی سکون نہیں ملتا۔ قدیم جدید نظر آتا ہے اور جدید قدیم، مگر دماغ اس کے ناممکن ہونے پر احتجاج کرتا ہے! وہ نہ مان کر ہی نہیں دیتا کہ "سورج نور سے عاری ہے"۔ ہم نے خود سے کہا کہ شاید اس کا سبب بےزاری، معلقات کی طوالت، گہرے رموز کا افشا، اساسات کی اصلیت کا کھل جانا، خوابوں کا بکھر جانا، آئندہ سے لگاؤ اور حال سے بےبیزاری ہو۔ ہم کو چاہیے کہ نفس کو صبر کا خوگر بنائیں اور باربار دہرائے جانے والے معمولات کے ساتھ لمحۂ موجود کو بالتفصیل گزاریں۔

کھانے پر ہمارے مہمان ہمارے ایک عزیز تھے جو ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ انھوں نے اوائل عمر ہی میں قرآن حفظ کر لیا تھا، اس کے ایک ایک لفظ سے واقف تھے اور آخر کو مؤذن ہو گئے تھے۔ ایک برس قبل جب ان کی اہلیہ نے وفات پائی تو انھوں نے اپنی ایک اور عزیزہ کو عقد کے لیے منتخب کر لیا۔ مؤذن کو مجرد رہنے کی اجازت نہیں، مگر انھوں نے یہ بہتر سمجھا کہ یہ فریضہ وہ حج سے واپسی کے بعد ادا کریں۔ ان کی غیرموجودگی میں خدائی فوجداروں نے مداخلت کی اور اس خاتون کا نکاح کسی اور سے کروا دیا۔ چنانچہ وہ اب بھی رشتے کی تلاش میں تھے۔

"الحمدللہ کہ تم خیر سے ہو۔ بندے کو ہر حال میں اور کیا حال ہیں؟ کاروبار کیسا چل رہا ہے؟ ٹھیک ٹھاک۔ ہمیں بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔ اور صاحب زادے کس حال میں ہیں؟ کام میں دل لگاتے ہیں۔ انھیں سے پوچھیے، خود بتائیں گے۔ ہمیں تو کام چور دکھائی پڑتے ہیں۔ بڑے شرم کی بات ہے بیٹا! کاش تم اپنے چچا عبدالرحمن کے نقش قدم پر چلتے۔"

ان کے الفاظ نے گویا ہمارے ذہن میں کسی بھولی بسری یاد کو بیدار کر دیا۔ ہم نے پوچھا:

"وہی جو غرق ہو کر مرے تھے؟"

"ہاں -- اور شہید بھی کہلائے تھے۔ جان لو کہ حدیث شریف کی رو سے تین قسم کے مُردے شہید کا درجہ رکھتے ہیں وہ جو آگ میں جل کر مرے، وہ

جو پانی میں غرق ہوئے، اور وہ جو کسی دیوار کے نیچے دب گئے۔"

اب ان کا روئے سخن صاحب زادے کی طرف ہو گیا۔ وہ ہر نوع اور ہر قسم کی ہدایت اور نصیحت سننے کا عادی تھا، اس لیے اس نے ذرا بھی ناگواری ظاہر نہیں کی۔

"تمھارا چچا عبدالرحمن ابھی اٹھارہ برس کا تھا جب علوم میں طاق ہو چکا تھا۔۔۔"

مسکراتے ہوئے صاحب زادے نے قطع کلام کیا:

"میں تو ابھی سترہ برس کا بھی نہیں ہوا۔"

ہم نے مناسب طور پر اسے سرزنش کی:

"تمھارا کھوپڑا گدھے کے سر سے بھی زیادہ خالی ہے۔ جو ہم کہیں اسے گرہ میں باندھ رکھو۔ مستقبل تمھارا ہے۔ ہماری نصیحتوں پر عمل نہیں کرو گے تو آپ بھگتو گے۔ تمھارا کیا جاتا ہے۔ روزی کمانا کچھ آسان کام ہے؟ کچھ کے سروں پر لٹک رہا ہے تو دوسروں کے سروں پر کام نہ سرسد۔"

حاجی صاحب نے اپنی بات جاری رکھی:

"عبدالرحمن — خدا اسے اپنے جوار رحمت میں جگہ دے — جملہ علوم میں طاق تھا۔ اس کی خطاطی ازحد دیدہ زیب تھی۔ محکمۂ مالیات میں ملازم تھا اور کم عمری ہی سے جبہ اور عمامہ پہنتا تھا۔ مشاق تیراک اور ماہر شہ سوار تھا۔ ایک مرتبہ ایک فقیہ، جو سوس سے ہماری ملاقات کو آئے تھے، اس سے مل کر اس کی عقیدت اور ذہانت سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے اس خوف سے کہ کہیں اس کو جن و انس کی نظر بد نہ لگ جائے ایک تعویذ، جو حرزالبحر اور دافع آفات کہلاتا ہے، لکھ کر دیا کہ اپنے جسم پر پہنے رہے تاکہ آفات سے محفوظ رہے۔"

گفتگو میں اپنی دلچسپی ظاہر کرنے کے لیے، گو اوپری ہی سہی، ہم نے کہا:

"اور اس تعویذ کے ہوتے ہوئے وہ غرق ہو گئے؟"

"مشیت الٰہی! وہ رباط سے سالے آ رہا تھا۔ وادی ابورقراق اس نے کشتی سے عبور کی تھی۔ پھر اس نے عمامہ اتار کر وضو کیا۔ ظہر کی نماز ادا کی۔ پھر وہاں سے روانہ ہو کر ابھی دس قدم گیا ہو گا کہ اس کا تیرنے کو جی چاہا۔ بس وہ اسی مقام کو لوٹا، اپنا لباس اتارا اور تیرنے لگا۔۔۔"

حسب معمول مسکراتے ہوئے صاحب زادے نے قطع کلام کیا:

"کیا اس زمانے میں لوگ سکے ہی پہنے تھے؟"

گو ہم کو یہ سوال معقول معلوم ہوا مگر یہ محل کسی اور ردعمل کا متقاضی تھا۔ چناں چہ ہم نے صاحب زادے کو کھا جانے والی نظروں سے گھُورا اور بےبسی کے اظہار میں کفِ افسوس ملا اور پورا زور لگ دیا کہ کہیں ہماری ہنسی نہ چھوٹ جائے۔

"نہیں، وہ لنگر باندھتے تھے۔ اُس دن اتفاق سے تعویذ دوسرے جبّے میں رہ گیا تھا اور پانی میں اس کی مشاقی ذرا کام نہ آئی اور سمندر اب تک اس کو دبائے بیٹھا ہے۔"

یوں عبدالرحمن تو اپنی جان سے گیا، رہ گئے دونوں جہان کے غم، تو اس میں سراسر نقصان میں ہم رہے۔

ابھی کھانا ختم نہیں ہوا تھا مگر باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ ہم اپنے مہمان کو آرام سے نوالہ چبانے دیکھتے رہے۔ سوچتے رہے کہ اب کس موضوعِ گفتگو میں ان کو لگائیں۔ ہم کو چند واقعات اور ادھر اُدھر کی باتیں یاد آئیں جو وہ ہم سے پہلے ہمیں کئی مواقع پر سنا چکے تھے۔ بس یاد دلانے کی دیر تھی کہ وہ شروع ہو جاتے۔ مثلاً ہم کہہ سکتے تھے کہ، اگلے وقتوں کے لوگ جب یہ نعرہ لگاتے تھے کہ "عزّت اور دولت سب مولائے عبدالعزیز کی"، تو واللہ دل سے لگاتے تھے۔ ان کے لیے اتنا اشارہ کافی تھا، وہ سلطان مولائے عبدالعزیز اور آس پاس کے قبائل کی جنگ و جدال کے واقعات سلسلہ وار سنانا شروع کر دیتے یہاں تک کہ فرانسیسیوں کے ورود تک پہنچ جاتے۔ تاہم یہ سوچتے ہوئے کہ یہ گفتگو اکتا دے گی ہم نے مناسب سمجھا کہ خود اُنھیں کے بارے میں بات چھیڑی جائے۔ اذان دینے اور نماز پڑھنے کے علاوہ باقی وقت کیوں کر گزرتا ہے؟ حرمین شریفین سے واپسی کے بعد حشیش انھوں نے ترک کر دی تھی اور نئی اہلیہ کا بھی دور دور پتہ نہیں تھا۔ آخر پھر وقت کس طرح کٹتا ہے؟ کیا وہ خود کو چلتی پھرتی لاش تصور کرتے ہیں؟ بظاہر اپنے اردگرد کی دنیا سے ان کا تعلق بہت محدود تھا۔ وہ بس ادھر اُدھر کی باتیں سن سنا کر اپنی حاشیہ آرائی کے ساتھ سنا دیا کرتے تھے، اور بات ختم یوں کرتے تھے کہ اللہ نے اختیار یوں تو سب کو دے رکھا ہے مگر اصل اختیار اُسی کا ہے۔

صاحب زادہ کھانے پر بدیدوں کی طرح گرتا ہے۔ ممکن ہے اس وقت خالی الذہن ہو، مگر وہ آس پاس ہونے والی باتوں پر توجہ دیتا ہے، میکانکی

انداز ہی میں سہی۔ وہ سگریٹ کا مزہ، پڑوس کی لڑکیوں کا تعاقب اور فٹ بال کا چسکا بھی دریافت کر چکا ہے۔ تھوڑے سے استمرار کے بعد وہ گرما کی تعطیلات میں یوروپ کے سفر کی خواہش کا اظہار بھی کرتا ہے، چاہے اس کو وہاں پاپیادہ ہی کیوں نہ جانا پڑے، (جس سے اس کے سفر کے اخراجات میں اضافہ ہی ہو گا)۔

اور ہم؟ ہم بزرگوار اور صاحب زادے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ ہم ان کے دل میں آنے والے خیالات کا اندازہ لگا رہے ہیں اردگرد کی دنیا سے ان کے رشتے کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کے بعد؟ قیلولہ۔ اور پھر؟ گھومیں پھریں گے، تازہ ہوا کھائیں گے۔ اور پھر؟ ہم اپنی رفیقہ کو ٹیلیفون کریں گے۔ کہیں ملیں گے، گپ لگائیں گے۔ ہماری حرارت بڑھے گی، جبلّتیں کھُل کھیلیں گی۔ پھر وہی بیزاری کا دوردورہ ہو گا اور ہم دونوں اپنی اپنی راہ لیں گے۔ پھر ہم اپنے دوستوں کے پاس جائیں گے۔ دنیا جہان کی باتیں کریں گے۔ کبھی مدح کریں گے کبھی ذم، اور یوں اپنے دل کا غبار نکالیں گے۔ مگر جب اپنی بےبسی کی انتہا کا اندازہ ہو گا تو سارا جوش بیٹھ جائے گا۔ ہم پھر سڑکوں پر نکل جائیں گے۔ عورتوں کے مدوّر اور بھرے بھرے جسموں کی جستیں دیکھ کر ہوس پھر سر اٹھائے گی۔ ہم اکثر اپنے متاہل احباب سے پوچھا کرتے ہیں، "تو گویا تمھاری اہلیہ اپنی صنف کی قائم مقام ہوتی ہے؟" ہم کو جواب یہ ملتا ہے، "ہرگز نہیں، بیوی سے محبّت رکھنے کے باوجود بیوی والوں سے زیادہ کوئی دوسری عورت کا خواہاں نہیں ہوتا"۔ ہم اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، عمل کے مطابق توجیہہ کرتے ہیں۔ سبب اس کا سراسر اختلاط مردوزن، پُرکشش اشتہارات، میک اَپ، اونچی ایڑی کی جوتی اور۔۔۔ اَور کیا ہے؟

ہم نے اس کو یہ بتایا تو اس نے سختی سے ٹوکا،

"سب بکواس۔ محبت کی مدد سے ہم ہوَس کو زیر کر سکتے ہیں۔"

"اور محبّت ہے کہاں؟"

"اچھا، تو تم بھی از قسم فوطی ہو۔ مجھی کو لو۔" اس کی کہانی بھی عام قسم کی نکلی۔ وہ اسے کسی بوڑھے سے بیاہنا چاہتے تھے تو اس نے خودکشی کی دھمکی دے دی، اور ان دونوں نے تامرگ ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کے وعدےوعید کیے وغیرہ وغیرہ۔

وہ ہماری بات سمجھا ہی نہیں؛ اس کے سامنے فرائڈ کا قول دہرانے کا

کیا فائدہ! "میں خود کو اس خیال کا خوگر بنانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہر وصل میں چار افراد شریک ہوتے ہیں"۔

ہم غلو سے کام لیتے ہیں اور وہ لمحہ ہم کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ صرف بوالہوسی نہیں جو دہلاتی اور اکساتی ہے۔ ترغیب تو جرم میں، خودکشی میں، شراب میں اور انقلاب میں بھی ہوتی ہے، مگر یہ دوسری قسمیں ہمیں اتنا نہیں اکساتیں، کیوں کہ ان سے مانوسیت کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی۔ اور لکھنا؟

میں چپ تھا اور وہ جواب دینے پر مائل نہ تھے؛ بس تسبیح کے دانے گن رہے تھے۔ عبدالباسط نے عرض کیا، "میں ہمیشہ سے جانتا آیا ہوں کہ جناب کے مقال میں وہ تاثیر ہے کہ آپ کے روبرو بڑے بڑے لسّان گنگ رہ جاتے ہیں اور ان کے دماغ لاجواب۔۔۔ آپ اپنے دل آویز ارشادات سے صبح شام ہمارے حوصلے کچھ یوں بلند کرتے ہیں کہ ان ارشادات کے خوش آئند نقوش ہمارے نفوس پر ثبت ہو جاتے ہیں۔ ہم نے تو جناب کو مدام اسی حالت میں پایا۔ پھر اب کیا ہوا؟"

شام کو ہمیں پھر وہی احساس ہوا ہڈیاں بکھری جا رہی ہیں، اور ایک دیگر اداسی بھی طاری ہو گئی۔ اس سے جان چھڑانے کے لیے ہم نے سوچا کہ ڈاکٹر کا وہی معروف نسخہ آزمایا جائے، مگر ہم کو تذبذب ہوا کہ ڈاکٹر نے وقت کا تعین کر دیا تھا؛ شام نہیں، صبح۔ تو کوچہ کوچہ آوارہ گردی کریں گے اور عوام النّاس کے چہروں کو تاڑیں گے، شاید کوئی علاج سوجھ جائے۔ ہم کافی دیر گردش میں رہے۔ کیفے کھچاکھچ بھرے ہوئے ہیں۔ بئر کی بوتلیں چشم زدن میں خالی ہو رہی ہیں۔ قہقہے گونج رہے ہیں۔ ہر دم چلتی ہوئی رَس نکالنے کی مشینیں کھڑکھڑا رہی ہیں۔ اس کے باوجود ہماری اداسی ہے کہ آڑی کھڑی ہے، جانے کا نام ہی نہیں لیتی۔ کاریں تیزرفتاری سے گزرتی ہیں۔ بسیں سست اور ٹھساٹھس بھری ہوئی ہیں۔ سینماؤں پر قدآور ہیرو اشتہار بنے کھڑے ہیں۔ یوں نظر آتا ہے کہ ہمارے چاروں طرف ہر شخص بھاگا چلا جا رہا ہے۔ جی چاہا ان کو روکنے کے لیے چلّائیں: "تم بھاگے جا رہے ہو؟" مگر یہ خیال احمقانہ اور بےجواز سا لگا۔ ہم نے دل سے پوچھا؛ کسی شے کو ثبات بھی ہے؟" پھر ہم اس حیات کی کہانی قلمبند کرنے کے لیے جو ہم قسطوں میں جیتے ہیں، گھر لوٹ آئے۔

Scanned with CamScanner

عليفه رفعت
حنان شيخ
بهاء طاهر
محمود دياب

علیفہ رفعت (Alifa Rifaat)

علیفہ رفعت قاہرہ میں ۱۹۳ کی دہائی میں پیدا ہوئیں اور اپنے بچوں کے ساتھ وہیں رہتی ہیں۔ ان کے مرحوم شوہر پولیس سے وابستہ تھے اور ان کی شادی شدہ زندگی مصر کے مختلف دیہات میں گزری۔ ان کی کہانیوں کے موضوع زیادہ تر اسی زمانے کے مشاہدوں پر مبنی ہیں۔ کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

حنان شیخ (Hanan Shaykh)

حنان شیخ جنوبی لبنان سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن ان کی ابتدائی زندگی زیادہ تر بیروت میں گزری۔ انہوں نے امیریکن کالج فار گرلز، قاہرہ میں تعلیم حاصل کی اور وہیں چوبیس سال کی عمر میں اپنا پہلا ناول لکھا۔ بیروت واپس آ کر وہ عورتوں کے ایک رسالے اور ایک بڑے روزنامے کے ادبی صفحے سے وابستہ رہیں۔ شادی کے بعد حنان اپنے شوہر کے ساتھ خلیج کے علاقے میں چلی گئیں اور وہاں کئی برس رہنے کے دوران انہوں نے دوسرا ناول لکھا۔ تیسرا ناول "زہرا کی کہانی" بیشتر لندن میں لکھا گیا جہاں اب ان کا گھر ہے۔ ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

بہاء طاہر (Bahaa Taher)

۱۹۲۵ میں قاہرہ کے مضافات میں جیزہ کے مقام پر پیدا ہوئے۔ ان کے خاندان کا تعلق بالائی مصر (مصرالعلیا) کے مقام کرناک سے تھا۔ قاہرہ یونیورسٹی سے تاریخ میں ڈگری حاصل کرنے کے بعد وہ ریڈیو قاہرہ میں ثقافتی پروگرام کے رکن ہو گئے اور انہوں نے یونانی ڈرامانگاروں سے لے کر سیموئل بیکٹ تک کے بہت سے کھیل نشر کیے۔ وہ کچھ عرصے تک قاہرہ کے ممتاز ادبی جریدوں کے لیے تھیٹر کے ناقد کے طور پر بھی لکھتے رہے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر انہیں ان کی مختصر کہانیوں کی وجہ سے جانا جاتا ہے، گو کہ ان کا صرف ایک مجموعہ ۱۹۷۲ میں شائع ہوا تھا۔ ۱۹۸۱ سے وہ جنیوا میں اقوام متحدہ کے دفتر میں عربی شعبے کے مترجم کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں

محمود دیاب (Mahmoud Diab)

محمود دیاب ۱۹۲٦ میں اسمٰعیلیہ، مصر، میں پیدا ہوئے اور قانون کے مضمون میں تعلیم حاصل کی۔ انہیں بنیادی طور پر ان کے ڈراموں کی وجہ سے شہرت حاصل ہے۔

Scanned with CamScanner

علیفہ رفعت

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

کلب میں ایک اور شام

وہ اضطراب کے عالم میں اپنے شوہر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ پیش گوئی کرنے سے قاصر کہ اس کے واپس آنے کے بعد ان دونوں میں کیا معاملہ پیش آئے گا، وسیع و عریض چوبی دالان میں، جو دریا کے کنارے پر پھیلا ہوا تھا، اور جس کے ستون کنارے کی زمین میں گڑے ہوئے تھے جن کے گرد گھاس پھوس اگ آئی تھی، وہ جھولاکرسی میں بیٹھی اپنے جسم کو آگے پیچھے حرکت دے رہی تھی۔ گویا اپنے اندیشوں کو جھٹکنے کے لیے اس نے اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ باغ کے کٹہرے تک پھیلے ہوئے یوکلپٹس کے پیڑوں کے پیولے اس کی نظر کے سامنے ہوا میں لہرا رہے تھے اور ان کی اونچی شاخوں پر بیٹھے ہوئے سفید پرندے اس کی باریک پتّیوں کے درمیان بڑے بڑے سفید پھولوں جیسے لگ رہے تھے۔

مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے سے پتلا سا چاند طلوع ہوا اور اس کی مدّھم روشنی میں، جو دریا پار، مملوط کے مکانوں سے آتی ہوئی روشنی میں گھل مل گئی تھی، دریا کی دھیمی سانسیں لیتی ہوئی سطح جھلملانے لگی۔ شہر کے آخری سرے پر واقع کلب کے باغ میں پیڑوں پر لگے ہوئے رنگین قمقمے اردگرد کے تاریک پس منظر میں صاف دکھائی دے رہے تھے۔ اسی

عمارت میں کہیں اس کا شوہر اس وقت غالباً شطرنج کی بازی میں محو، بیٹھا تھا۔

یہ صرف چند سال پہلے کی بات تھی جب اس نے اپنے باپ کے گھر میں اس شخص کو پہلی بار دیکھا تھا، اور اس کی نظر سے نظر ملائی تھی جو اس کے حسن کو مول کر گویا دام لگانے سے پہلے اس کی ارزش کا اندازہ لگا رہی تھی۔ جب اس نے ان جاپانی پیالیوں میں جو اہم مہمانوں کی تواضع کے واسطے الماری میں مقفل رکھی جاتی تھیں، اسے قہوہ پیش کیا تو اس کی نگاہوں کو اپنے بدن پر محسوس کیا تھا۔ اس کی ماں نے یہ پیالیاں چاندی کے کام والی کشتی میں سجا کر اپنے ہاتھ سے کڑھائی کی پوشش بچھا کر اپنے ہاتھ سے سجائی تھیں۔ جب دونوں مرد قہوہ ختم کر چکے، تو اس کے باپ نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا تھا اور اسے بیٹھنے کو کہا تھا، اور وہ ان کے سامنے والے صوفے پر گھٹنوں کو اپنے لباس کے دامن سے ڈھانپ کر بیٹھ گئی تھی اور چور نظروں سے اس شخص کو دیکھتی رہی تھی جو شاید اسے اپنی بیوی کے طور پر منتخب کرنے والا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ "وہ دراز قد جسم کا مصوم" اور کلین شیو تھا۔ اس کا انگلش ٹویڈ کا عمدہ سلا ہوا کوٹ، ریشمی قمیص اور طلائی کف لنک خاص طور پر اس کی نظر میں آئے۔ جب اس نے خوشاً اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو اپنے چہرے پر سرخی دوڑتی ہوئی محسوس کی۔ پھر وہ اس کے باپ کی طرف مڑا اور اپنا سنہری سگریٹ کیس نکال کر اسے سگریٹ پیش کیا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے جناب،" یہ کہہ کر اس کے باپ نے احتراماً اپنا دایاں ہاتھ سینے پر رکھا اور کپکپاتی ہوئی انگلیوں سے ایک سگریٹ لے لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنی ماچس تلاش کر پاتے، عود نے اپنا لائٹر نکال چکا تھا۔

"نہیں جناب، پہلے آپ" اس کا باپ شرمندہ ہو کر بولا۔ وہ بیک وقت اس شخص کے دنیوی خود اعتمادی کے انداز سے مسحور اور اپنے باپ کے بے ڈھنگے پن پر محجوب تھی۔

اس کے باپ کا سگریٹ سلگانے کے بعد عود نے نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتی ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور اپنے لیے سگریٹ نکالا۔ اسے اپنے ہونٹوں کے کونے میں دبا کر سلگانے سے پہلے اس نے سگریٹ کے سرے کو کیس کے ڈھکنے پر آہستہ سے دو ایک بار ٹھونکا، پھر منہ سے دھوئیں کے چھلے برآمد

کیے جو کمرے کی ہوا میں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگے۔

"یہ ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے، میرے بیٹے،" اس کے باپ مسکرا کر پہلے عبود بے کی اور پھر اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا، جس پر عبود بے نے بھی اس پر نظر ڈالی اور پوچھا،

"اور حسین دوشیزہ ابھی ثانوی اسکول میں ہے؟"

اس نے انکسار سے سر جھکا لیا تھا اور اس کے باپ نے جواب دیا تھا،

"آج کے بعد یہ گھر پر رہ کر خود کو آپ کے ساتھ پُرمسرت زندگی گزارنے کے لیے تیار کرے گی، انشاءاللہ،" اور وہ اپنے باپ کی آنکھ کے اشارے پر اٹھ کر باورچی خانے میں اپنی ماں کے پاس چلی گئی تھی۔

"تمھاری خوش نصیبی ہے،" اس کی ماں نے اسے بتایا تھا۔ "ایسا گھر کہاں ملتا ہے۔ کوئی بھی لڑکی اسے پا کر خوش ہو گی۔ عمر چالیس سال بھی نہیں ہے، اور آب پاشی کا انسپکٹر ہے۔ اچھی تنخواہ ہے اور جہاں تعیناتی ہوتی ہے وہاں رہنے کے لیے فرنیچر سمیت سرکاری مکان ملتا ہے؛ اس سے ہم مکان دینے کے خرچ سے بھی بچ جائیں گے -- اور ہمارے جو حالات ہیں وہ تمھیں معلوم ہی ہیں -- اور یہ اسکندریہ میں اس کے ذاتی مکان کے علاوہ ہے جہاں تم چھٹیاں گزارا کرو گی۔"

سمیہ کو اس بات پر تعجب تھا کہ ایسا شاندار گھر اس کے دروازے پر کیسے چلا آیا۔ اسے کس نے بتایا کہ اپیل کورٹ کے ایک معمولی کلرک محمود برکات کے ہاں ایک خوب صورت اور خوب سیرت بیٹی ہے؟

پھر دن قاہرہ کی دکانوں کے چکر کاٹنے اور آنے والی پُرآسائش زندگی کے لیے ساسوں کے انتخاب میں گزرنے لگے۔ یہ سب اس طرح ممکن ہوا کہ اس کے باپ نے اپنی سرکاری پنشن میں سے کچھ رقم قرض لے لی۔ دوسری طرف عبود بے کبھی اس کے گھر تحفے کے بغیر نہ آیا۔ شادی سے چند روز پہلے، اس کی سالگرہ پر، وہ شارع قصرالنیل کی ایک مشہور دکان کے نام سے مزین مخملیں ڈبے میں اس کے لیے زمرد کی انگوٹھی لایا۔ عروس کی رات کو اس کی کلائی پر ہیرے کا دست بند باندھتے ہوئے اس نے یاددہانی کرائی کہ اس کی شادی ایک ایسے شخص سے ہوتی ہے جسے ترقی کی راہ پر بہت آگے جانا ہے اور یہ کہ زندگی کی اہم ترین چیزوں میں سے ایک چیز دوسروں، خصوصاً اہم رتبہ اور اعلیٰ تر لوگوں کی رائے ہے۔ اگرچہ اس کا سن ابھی بہت کم ہے، پھر بھی اسے مناسب اور پُروقار اندار اختیار کرنے کی کوشش کرنی

چاہیے۔

"لوگوں سے کہنا کہ تمھارا تعلق مشہور برکات خاندان سے ہے اور تمھارے والد جج تھے۔" یہ کہہ کر اس نے قریب آ کر اس کے گالوں کو باپ کی سی شفقت اور ملائمت سے تھپتھپایا تھا، یہ اس کا مخصوص انداز تھا جسے وہ ان دونوں کی مشترک زندگی کے آنے والے دنوں میں بارہا دوہرانے والا تھا۔

کل شام وہ بیئر کی بوتل کے اثر سے کچھ مدہوش سی کلب سے لوٹی تھی، جو اسے کسی کی سالگرہ کی خوشی میں پینی پڑی تھی۔ اس کا شوہر اس کی کیفیت کا اندازہ کر کے اسے جلد ہی گھر لے آیا تھا۔ اس نے کپڑے اتار کر نائٹ گاؤن پہن لیا تھا اور زیور سنگھارمیز پر پڑے چھوڑ کر بستر پر گرتے ہی گھری نیند سو گئی تھی۔ اگلی صبح وہ دن چڑھے تک سوتی رہی تھی، پھر جاگنے پر اس نے معمول کے مطابق گھنٹی بجا کر اپنے لیے ناشتہ طلب کیا تھا۔ ناشتے کے بعد زیوروں کو لکڑی اور سیپی کے بنے ہوئے ڈبوں میں رکھتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ اس کی زمرّد کی انگوٹھی غائب ہے۔

کیا انگوٹھی کلب میں اس کی انگلی سے گر پڑی؟ یا واپسی پر کار میں؟ نہیں، اسے رات کو سونے سے پہلے انگوٹھی اتارنا اچھی طرح یاد تھا! اسے یاد تھا کہ ہمیشہ کی طرح اسے انگوٹھی اتارنے میں دقت ہوئی تھی۔ اس نے بستر کی چادریں اتار دیں، گدّے کو الٹ دیا، تکیہ غلافوں کو جھاڑا، گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل مسہری کے نیچے گھس کر دیکھا۔ پھر اسے سرہانے کی میز پر ناشتے کی کشتی دکھائی دی اور اس کے ساتھ ہی اس نوعمر ملازمہ کا خیال آیا جو اسے لے کر صبح کمرے میں داخل ہوئی تھی، اسے کشتی کے رکھے جانے کی جھنکار، پردوں کا کھولا جانا اور کشتی کا پھر اٹھا کر سرہانے کی میز پر رکھا جانا یاد آیا۔ کمرے میں اس ملازمہ کے سوا کوئی داخل نہیں ہوا تھا۔ کیا اسے اس کو بلا کر پوچھ گچھ کرنی چاہیے؟

بالآخر، اسپرین کی دو گولیاں کھا کر، اس نے شوہر کے کام پر سے واپس آنے تک کچھ نہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

جیسے ہی وہ دفتر سے لوٹا تھا اس نے سارا قصہ کہہ سنایا تھا، اور اس نے اس کا بازو تھام کر اسے اپنے برابر میں بٹھا لیا تھا۔

"چلو اب سکون سے مجھے پورا واقعہ تفصیل سے سناؤ۔"

اس نے پوری بات، اس بار زیادہ تفصیل کے ساتھ، دوہرائی تھی۔

"تم نے اسے تلاش کیا؟"

"ہر جگہ۔ خواب گاہ اور غسل خانے کے کونے کونے میں ہر ممکن اور غیرممکن جگہ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ رات کو سونے سے پہلے میں نے انگوٹھی اتاری تھی۔"

گزشتہ رات کا خیال آنے پر وہ مسکرا اٹھا، پھر بولا:

"جاریہ کے ناشتہ لانے کے بعد سے کوئی کمرے میں آیا؟"

"کوئی نہیں۔ میں نے جاریہ کو آج کمرے کی صفائی کرنے سے بھی منع کر دیا۔"

"تم نے اس سے ذکر تو نہیں کیا؟"

"نہیں۔ میں نے سوچا کہ معاملہ آپ پر چھوڑ دوں۔"

"بہت اچھا کیا۔ اب جا کر اس سے کہو کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اسے کچھ بتانا مت، لیکن جب میں اس سے بات کروں تو یہیں موجود رہنا۔"

پانچ منٹ بعد نوعمر جاریہ، جسے انھوں نے حال ہی میں ملازم رکھا تھا، اپنی مالکن کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوئی۔ سمیعہ گزر کر کمرے کے کونے میں چلی گئی اور جاریہ سینے پر ہاتھ باندھے، آنکھیں جھکائے عبود کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"حضور؟"

"انگوٹھی کہاں ہے؟"

"کون سی انگوٹھی حضور؟"

"اداکاری مت کرو جیسے تمھیں پتا ہی نہیں۔ سبز نگینے والی انگوٹھی۔ تمھاری بہتری اسی میں ہے کہ انگوٹھی چپ چاپ واپس کر دو؛ تمھیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔"

"اگر میں نے دیکھی بھی ہو تو اللہ کرے میری آنکھیں پھوٹ جائیں۔"

وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اچانک اس کے منھ پر ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ لڑکی تیورا کر پیچھے کو ہوئی۔ اس نے ہاتھ گال پر رکھ لیا، پھر اس نے دوبارہ سینے پر ہاتھ باندھ لیے، اور عبود نے کئے سوالوں کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ آخر وہ بولا:

"تمھارے پاس صرف پندرہ سیکنڈ ہیں بتا دو کہ تم نے انگوٹھی کہاں چھپائی ہے، ورنہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمھارے ساتھ بہت برا ہو گا۔"

اس نے گھڑی دیکھنے کے لیے اپنی کلائی اٹھائی تو لڑکی ڈر کر پیچھے کو

Scanned with CamScanner

تھی۔ مگر اس کی خاموشی قائم رہی۔ جب وہ ٹیلیفون کی طرف بڑھا تو سمیعہ نے سر اٹھا کر دیکھا کہ لڑکی کے گال آنسوؤں سے تر ہیں۔ عوض نے سپرنٹنڈنٹ پولیس کا نمبر ملایا اور اسے مختصراً پوری بات بتائی۔

"ظاہر ہے میرے پاس ثبوت تو کوئی نہیں ہے لیکن صبح سے اور کسی نے کمرے میں قدم نہیں رکھا، اس لیے ضرور اسی نے لی ہو گی۔ بہرحال میں نے معاملہ آپ کے دانشمند ہاتھوں کو سونپ دیا ہے ۔ میں جانتا ہوں آپ کے آدمیوں کے اپنے طریقے ہوتے ہیں۔"

ایک دن بعد، آج سہ پہر وہ سنگھار میز کے سامنے بیٹھی اپنے زیوروں کو ڈبے میں ترتیب سے رکھ رہی تھی کہ ایک بُندا اس کے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر گر پڑا۔ جب وہ اسے اٹھانے کو جھکی تو اسے زمرد کی انگوٹھی سنگھار میز اور دیوار کے بیچ میں اٹکی ہوئی دکھائی دی۔ اس لمحے سے اب تک وہ ایک اضطراب کے عالم میں بیٹھی اپنے شوہر کے کلب سے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک بار تو اسے یہ ترغیب بھی ہوئی کہ دریا کے کنارے جا کر انگوٹھی کو پانی میں اچھال دے تاکہ اس ناخوشگواری سے بچ سکے جو آنے والی تھی۔

مکان کے گرد گھوم کر گراج میں آتی ہوئی گاڑی کے ٹائروں کی آواز سن کر اس نے انگوٹھی جلدی سے اپنی انگلی میں چڑھا لی۔ جیسے ہی وہ داخل ہوا، اس نے کھڑے ہو کر اسے انگوٹھی دکھانے کے لیے اپنا ہاتھ بلند کیا۔ جلدی جلدی کہنے کے لیے موزوں الفاظ تلاش کرتے ہوئے اور پھر بھی جانتے ہوئے کہ وہ بے ڈھنگے پن سے بات کر رہی ہے، اس نے اس غیرمعمولی اتفاق کی وضاحت کی کہ کس طرح بُندے کے فرش پر گرنے کی وجہ سے اسے انگوٹھی دکھائی دے گئی اور کس طرح اسے خیال آتا تھا کہ کلب میں ٹیلیفون کر کے اسے خوشخبری سنائے مگر...

اس نے شوہر کی چڑھی ہوئی تیوری کو دیکھ کر اپنی بات بیچ ہی میں روک دی، اور جلدی سے کہا: "مجھے بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ ہوا کیسے۔ اب کیا کریں گے؟"

اس نے گویا حیرت کے انداز میں کندھے اچکائے۔

"تم مجھ سے پوچھ رہی ہو جانِ من؟ ظاہر ہے کچھ بھی نہیں کریں

گے۔"

"لیکن وہ اس بےچاری لڑکی کی پٹائی کر رہے ہوں گے -- آپ نے خود ہی تو کہا تھا وہ اعتراف کرائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔"

کسی عجلت کے بغیر وہ یوں بیٹھ گیا جیسے معاملے کے اس نئے پہلو پر غور کر رہا ہو۔ اپنا سگریٹ کیس نکال کر اس نے اپنے مخصوص انداز میں سگریٹ کو اس کے ڈھکنے پر ٹھونکا، زبان پھیر کر ہونٹ تر کیے، سگریٹ کو ہونٹوں میں دبایا اور سلگایا۔ دھوئیں کے چھلّے ٹھہری ہوئی ہوا میں تیرنے لگے اور وہ اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے بولا:

"بہرحال، اب وہ اور کتنی دیر اسے وہاں رکھ سکتے ہیں۔ اگر وہ اعتراف نہ کرے یا کوئی شہادت نہ ملے تو اسے اڑتالیس گھنٹوں سے زیادہ تو رکھ نہیں جا سکتا۔ تھوڑی دیر اور وہاں رہ لینے سے اسے موت نہیں آ جائے گی۔ اب تک سارا شہر جان چکا ہے کہ انگوٹھی ملازمہ نے چرائی ہے -- یا تم مجھ سے یہ توقع رکھتی ہو کہ جا کر سب لوگوں کو بتاؤں کہ بیگم صاحبہ بیئر کے دو گھونٹ پی کر ایسی مدہوش ہو گئی تھیں کہ انگوٹھی خودبخود ان کی انگلی سے اتر کر سنگھارمیز کے پیچھے جا چھپی؟ کیا خیال ہے تمہارا؟"

"میں جانتی ہوں کہ بات ذرا شرمندگی کی ہے مگر..."

"ذرا شرمندگی کی؟ انتہائی مضحکہ خیز بات ہے۔ سنو، اب سوائے اس کے کچھ نہیں ہو سکتا کہ تم یہ انگوٹھی مجھے دے دو اور میں جب اگلی بار قہوہ جاؤں تو اسے بیچ کر اس کی جگہ کچھ اور لے آؤں۔ ورنہ سارے شہر میں ہمارا مذاق بن جائے گا۔"

عورت نے اپنا ہاتھ پھیلایا اور اس نے خود کو انگوٹھی اتار کر اس پھیلی ہوئی ہتھیلی پر رکھتے ہوئے پایا۔ وہ احتیاط کر رہی تھی کہ ان کی نظریں نہ ملنے پائیں۔ ایک لمحے کو اس میں احتجاج کی لہر سی اٹھی، بلکہ اس نے کچھ لفظ بھی منہ سے نکالے:

"مگر میں کہتی ہوں ہمیں..."

انگوٹھی جیب میں رکھتے ہوئے وہ اس پر جھکا اور دونوں بانہوں سے اس کے گال نرمی سے تھپتھپائے۔ وہ اس انداز کی عرصے سے عادی ہو چکی تھی، اس سے اسے تحفظ کے جاری رہنے کی تسلّی ہوتی تھی، اسے احساس ہوتا تھا کہ اس آدمی نے جو اس کا شوہر ہے اور اس کے بچے کا باپ ہے، اس

کی زندگی میں اس کے باپ کی جگہ لے لی ہے جو، گویا اپنی ذمےداری ایک موزوں شخص کو سونپنے کے اطمینان میں، شادی کے کچھ ہی دنوں بعد چل بسا تھا۔ یہ لمس اسے لفظوں سے کہیں زیادہ بلاغت سے یہ احساس دلاتا تھا کہ یہ شخص مرد ہے اور وہ عورت؛ اس شخص کا منصب ذمےداریاں اٹھانا اور فیصلے کرنا ہے، اور اس کا کام صرف خوب صورت، مسرور اور بےفکر رہنا ہے۔ مگر اب، ان دونوں کی ساتھ گزاری ہوئی زندگی میں پہلی بار اسے یہ لمس اپنے چہرے پر ایک طمانچے کی طرح لگا۔

جوں ہی اس کے ہاتھ ہٹے، سمیعہ کا پورا بدن ایک بےاختیار لرزے کی زد میں آ گیا۔ اس خوف سے کہ کہیں اسے پتا نہ چل جائے، وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور سنبھل سنبھل کر چلتی ہوئی بڑی کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اس نے پیشانی آرام دہ، سرد سطح سے ٹکا لی اور کئی سیکنڈ تک آنکھیں بند رکھیں۔ جب اس نے آنکھیں دوبارہ کھولیں تو دیکھا کہ دریا کے دوسرے کنارے پر پیڑوں پر لگی ہوئی قہوہ خانے کی بتیاں روشن ہو چکی ہیں اور ان کے نیچے لوگ کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور ایک ویٹر میزوں کے درمیان آ جا رہا ہے۔ ایک گزرتی ہوئی کشتی کے تاریک ہیولے نے ذرا دیر کے لیے قہوہ خانے کے منظر کو ڈھانپ لیا؛ اس کے سامنے والے حصے میں نصب لیمپ کی روشنی میں اس نے کشتی کو نیل کی سطح پر تیرتے نیلوفر کے بےجڑ کے پھولوں سے بنے ہوئے کئی جزیروں کو کاٹ کر آگے بڑھتے دیکھا جنھیں لہریں اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہیں۔

اچانک اسے اپنے برابر میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"جب تک میں گاڑی باہر نکالوں، کیوں نہ تم جلدی سے جا کر تیار ہو جاؤ؟ آج ہوا گرم ہے، رات کا کھانا کلب میں کھایا جائے۔"

"کیوں نہیں؟ جیسا آپ کہیں۔"

جب وہ کھڑکی کے پاس سے مڑی تو مسکرانے لگی تھی۔

Scanned with CamScanner

حنان شیخ

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

قالین

جب مریم میرے بالوں کو چھوٹی چھوٹی دو چوٹیوں میں گوندھ چکی تو اس نے انگلی منہ تک لے جا کر اس کے سرے کو زبان سے تر کیا، پھر اسے میری بھنوؤں پر پھیرتے ہوئے آہستہ آواز میں کہنے لگی: "آہ، تمھاری بھنویں کیا خوب ہیں، پورا گھر ان کے سائے میں لگتا ہے۔" پھر وہ تیزی سے میری بہن کی طرف مڑی اور اس سے بولی: "جا کر دیکھو، کیا تمھارے ابّا اب تک بھار پڑھ رہے ہیں۔" اس سے پہلے کہ میں جان سکوں، میری بہن جا کر واپس آ چکی تھی اور سرگوشی میں کہہ رہی تھی: "ہاں، اب تک پڑھ رہے ہیں۔" اس نے ان کی نقل کرتے ہوئے اپنے ہاتھ اٹھائے اور انھیں آسمان کی طرف بلند کیا۔ میں ہنسی نہیں جیسے ہمیشہ کرتی تھی۔ مریم بھی نہیں ہنسی؛ بجائے اس کے، اس نے کرسی پر سے اپنی اوڑھنی لی اور بالوں کو اس سے ڈھانپ کر جلدی سے اسے گردن کے گرد لپیٹ لیا۔ پھر بہت احتیاط سے الماری کھول کر اس نے اپنا تھیلا نکالا، اسے بغل میں دبایا اور اپنا ایک ایک ہاتھ ہم دونوں کی طرف بڑھا دیا۔ ایک ہاتھ میں نے پکڑ لیا اور دوسرا بہن نے۔ ہم سمجھ گئے کہ ہمیں بھی اس کی طرح دبے پاؤں، سانس روک کر سامنے کے کھلے ہوئے دروازے کی جانب چلنا ہے۔ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ہم نے مڑ کر دروازے کو

دیکھا، پھر کھڑکی کو۔ آخری سیڑھی تک پہنچ کر ہم دوڑنے لگے اور اس وقت تک نہ رکے جب تک گلی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی اور ہم نے سڑک پار نہ کر لی اور مریم نے ٹیکسی نہ روک لی۔

ہمارے اس طرزعمل کا سبب خوف تھا، کیونکہ آج ہم امی کے طلاق لے کر ابا کے گھر سے چلے جانے کے بعد پہلی بار اُن سے ملنے جا رہے تھے۔ ابا نے قسم کھا کر کہا تھا کہ وہ امی کو کبھی ہماری صورت نہیں دیکھنے دیں گے، کیونکہ طلاق کے چند ہی گھنٹوں بعد خبر پھیل گئی تھی کہ وہ اُس شخص سے شادی کرنے والی ہیں جس سے وہ، اپنے والدین کے مجبور کرنے پر ابا سے شادی کرنے سے پہلے، پیار کرتی تھیں۔

میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، خوف سے یا دوڑنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ امی سے ہونے والی ملاقات کے اشتیاق اور گھبراہٹ کے احساس کی وجہ سے۔ میں نے خود پر اور اپنی شرم پر قابو پا رکھا تھا، پھر بھی میں جانتی تھی کہ خواہ کسی بھی کوشش کروں، میں اپنی ماں کے سامنے کبھی اپنے جذبات کا اظہار کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ میرے اختیار سے باہر تھا کہ امی سے لپٹ جاؤں، انہیں بوسے دینے لگوں اور ان کا سر سینے سے بھینچ لوں، جبکہ یہی وہ سب بڑی بےساختگی سے کر سکتی تھی۔ جس وقت مریم نے مجھ سے اور بہن سے سرگوشی میں کہا تھا کہ ہم اگلے روز امی سے ملنے جانے والے ہیں تبھی سے میں اس مستقل اور شدید فکر میں غرق تھی۔ میں نے تصوّر کرنا شروع کر دیا تھا کہ میں وہی کروں گی جو یہی کرے گی؛ میں اس کے پیچھے کھڑی ہو جاؤں گی اور اس کی حرکات کی نقالی کرنے لگوں گی۔ مگر میں اپنےآپ کو جانتی ہوں؛ میں نے خود کو خود پر حرف بہ حرف نقش کر رکھا ہے۔ میں کتنا ہی خود کو آمادہ کرنے کی کوشش کروں، کتنا ہی پہلے سے سوچ کر رکھوں، اصل صورت حال کا سامنا ہونے پر، فرش پر نظر گاڑے بےحرکت کھڑے ہوئے، جبکہ میری پیشانی پر پڑے ہوئے بل اور گہرے ہو رہے ہوں گے، مجھے معلوم ہو گا کہ میں وہ سب کچھ بھول چکی ہوں جو میں نے طے کیا تھا۔ گو اس کے باوجود میں امید ترک نہیں کروں گی اور اپنے دہن سے ایک خفیف مسکراہٹ پیدا کرنے کی التجا ضرور کروں گی، جو، بہرحال، بےاثر ہی ثابت ہو گی۔

جب ٹیکسی ایک مکان کے دروازے کے سامنے رکی جہاں سُرخ سنگی ستونوں پر دو شیر کھڑے تھے تو میرا دل خوشی سے بھر گیا اور اندیشے

میرے ذہن سے یک لخت محو ہو گئے۔ میں اس خیال پر مسرّت سے مغلوب ہو گئی کہ امّی ایک ایسے مکان میں رہ رہی ہیں جہاں صدردروازے پر دو شیر کھڑے ہیں۔ میں نے بہن کی آواز سنی جو شیر کے دہانے کی نقل اتار رہی تھی، اور رشک سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنے پنجے پھیلا کر اشارے سے شیر کو گرفت میں لانے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے دل میں کہا، یہ ہمیشہ پیچیدگی سے آزاد اور خوش طبع رہی ہے۔ اس کی خوش دلی کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی، انتہائی نازک لمحوں میں بھی نہیں۔ وہ میرے سامنے تھی اور ہونے والی ملاقات کے بارے میں ذرّہ بھر فکرمند نہیں تھی۔

لیکن جب امّی نے دروازہ کھولا اور میری نظر ان پر پڑی تو میں نے خود کو بےبس اور بےتاب پایا اور دوڑ کر بہن سے بھی پہلے ان سے لپٹ گئی۔ میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں اور میرے بدن کے جوڑ اس آسائش سے اتنے دنوں تک محروم رہنے سے سُن ہو گئے تھے۔ میں نے اُن کے بالوں کی مہک سونگھی جو ذرا بھی نہ بدلی تھی اور مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ میں نے ان کی جدائی کو کس قدر محسوس کیا تھا اور، اس کے باوجود کہ ابّا اور مریم ہمارا اتنا خیال رکھتے تھے، میں نے کس قدر چاہا تھا کہ وہ لوٹ آئیں اور ہمارے ساتھ رہنے لگیں۔ امی کی اُس وقت کی مسکراہٹ میرے ذہن سے محو نہ ہوئی تھی جب، ان کی خود پر مٹّی کا تیل چھڑک کر آگ لگا لینے کی دھمکیوں کے بعد اور مولوی کی دخل اندازی پر ابا انہیں طلاق دینے پر رضامند ہو گئے تھے۔ میری تمام حسیں اُن کی خوشبو کے اثر سے کُند ہو گئی تھیں جو میرے حافظے میں اچھی طرح محفوظ تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ مجھے ان کی جدائی کس قدر کھَل رہی تھی، اس کے باوجود کہ جب وہ ہم دونوں کو بوسے دینے کے بعد اپنے بھائی کے پیچھے نپے قدموں سے چلتی ہوئی، کار میں جا بیٹھی تھیں تو ہم دوبارہ گھر کے باہر گلی میں جا کر اپنے کھیل میں لگ گئے تھے۔ پھر جب رات آئی، اور ایک طویل عرصے بعد ہمیں امّی کے ابّا سے تکرار کرنے کی آواز سنائی نہ دی، تو ہمارے گھر پر امن اور سکون کی فضا چھا گئی جس میں صرف مریم کے رونے کی آواز مخل ہوتی تھی جو ابّا کی دشمنےدار تھی اور میری پیدائش کے وقت سے ہمارے ساتھ رہ رہی تھی۔

امّی نے مسکراتے ہوئے مجھے خود سے جدا کیا تاکہ بہن کو لپٹا کر پیار

کر سکیں پھر وہ مریم سے بھی بغل گیر ہوئیں جو رونے لگی تھی۔ امی کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے اور میں نے انھیں مریم کا شکریہ ادا کرتے سنا۔ انھوں نے آستین سے آنسو پونچھے اور مجھ پر اور بہن پر سر سے پاؤں تک نگاہ ڈالی اور کہا، "اللہ انھیں اپنی امان میں رکھے، دونوں کتنی جلدی بڑی ہو گئی ہیں۔" انھوں نے مجھے اپنی باہوں میں بھر لیا اور بہن نے ان کی کمر میں منھ چھپا لیا اور جب ہمیں احساس ہوا کہ اس حالت میں چلنا ہمارے لیے دشوار ہے تو ہم سب ہنسنے لگے۔ اندر کے کمرے میں پہنچ کر مجھے یقین ہو گیا کہ امی کے نئے شوہر گھر میں موجود ہیں، کیوں کہ امی نے مسکرا کر کہا، "محمود کو تم دونوں سے بہت محبت ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ تمھارے ابا تمھیں میرے سپرد کر دیں تاکہ تم ان کے بچّوں کی طرح ہمارے ساتھ رہ سکو۔" بہن ہنسنے لگی اور جواب میں بولی، "اس طرح ہمارے دو ابا ہو جائیں گے۔" میں امی کے بازو پر ہاتھ رکھے ابھی تک گم سُمگی کی کیفیت میں تھی، اور امّی سے ملاقات کے لمحے میں اپنے بےساختہ برتاو پر حیران تھی؛ کس طرح میں دوڑ کر ان سے لپٹ گئی تھی، جو مجھے ناممکن معلوم ہوتا تھا اور کیسے آنکھیں بند کر کے انھیں چومنے لگی تھی۔ مجھے بلاکوشش، بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ، اپنےآپ سے، شرم کے ان شکنجوں سے رہائی پا لینے پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔

امی کے شوہر گھر پر نہیں تھے۔ میری نظر فرش پر پڑی تو میں اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔ میں نے بےاختیاری کے عالم میں فرش پر بچھے ہوئے ایرانی قالین کو گھورا پھر امّی پر ایک طویل نظر ڈالی۔ میری نظر کی معنویت کو نہ سمجھتے ہوئے انھوں نے ایک الماری کھولی اور اس میں سے ایک کڑھی ہوئی قمیص نکال کر میری طرف اُچھال دی۔ پھر وہ فرش عبور کر کے سنگھارمیز کے پاس گئیں اور اس کی دراز میں سے ہاتھی دانت کی ایک کنگھی نکال کر، جس پر سرخ رنگ سے دل کی تصویر نقش کی ہوئی تھی، انھوں نے بہن کو دی۔ میں نے ایک بار پھر امّی کی طرف دیکھا، اور اس بار انھوں نے میری نگاہ کو نازک تمنّا کا اظہار سمجھا۔ اس لیے انھوں نے مجھے باہوں میں لے لیا اور بولیں، "تم ہر روز آ جایا کرو، تم جمعے کو پورے دن میرے گھر رہا کرو۔" میں ساکت رہی۔ میری خواہش تھی کہ میں ان کے بازو اپنے گرد سے ہٹا دوں اور اس گوری کلائی میں دانت گاڑ دوں۔ میں نے ملاقات کے لمحے کے مٹ جانے کی خواہش کی اور چاہا کہ وہ لمحے دوبارہ

Scanned with CamScanner

پیش آئیں تاکہ جب وہ دروازہ کھولیں تو میں وہی کروں جو مجھے کرنا چاہیے تھا -- یعنی فرش پر نظر گاڑے بے حرکت کھڑی رہوں۔

اس ایرانی قالین کے رنگ اور خطوط میرے حافظے پر نقش تھے۔ میں اس پر لیٹ کر اپنا سبق یاد کیا کرتی تھی۔ میں اسے قریب سے اس پر بنے ہوئے نقوش کو تکتی تھی کہ وہ مجھے سارے میں پھیلی ہوئی ترمور کی قاشیں معلوم ہونے لگتے تھے۔ مگر جب میں مسہری پر بیٹھ کر اسے دیکھتی تو مجھے محسوس ہوتا کہ ترمور کی ہر قاش باریک دندانوں والی ایک کنگھی میں بدل گئی ہے۔ اس کے کناروں پر چاروں طرف بنے ہوئے پھولوں کے گچھے اُودے رنگ کے تھے۔ گرمیوں کے شروع میں امی اس پر اور دوسرے عام قالینوں پر کیڑے مار گولیاں ڈال دیتیں اور ان سب کو گول کر کے الماری کی چھت پر رکھ دیتیں۔ کمرہ خالی اور ویران نظر آنے لگتا، یہاں تک کہ جاڑا آ جاتا جب وہ قالینوں کو چھت پر لے جا کر پھیلا دیتیں۔ وہ کیڑے مار گولیاں چُنتیں جن میں سے اکثر گرمی اور نمی سے گھل چکی ہوتی تھیں پھر چھوٹی جھاڑو سے ان کی صفائی کر کے وہ قالینوں کو چھت پر ہی چھوڑ دیتیں۔ شام کو وہ انھیں نیچے لا کر اپنی اپنی جگہ پر بچھا دیتیں۔ ان کے بچھنے سے کمرے میں دوبارہ جان پڑ جاتی اور میرا دل خوشی سے بھر جاتا۔ مگر یہ والا قالین کئی مہینے ہوئے، امی کی طلاق سے پہلے، گم ہو چکا تھا۔ اسے چھت پر دھوپ دینے کے لیے پھیلایا گیا تھا، اور سہ پہر کو امی چھت پر گئیں تو غائب تھا۔ انھوں نے ابّا کو آواز دے کر بلایا تھا اور میں نے پہلی بار ابّا کا چہرہ غصے سے سرخ دیکھا تھا۔ جب وہ دونوں چھت سے نیچے آئے تو امّی طیش اور تعجب کے عالم میں تھیں۔ انھوں نے پڑوسیوں سے دریافت کیا جن میں سے ہر ایک نے قسم کھا کھا کر کہا کہ اس نے نہیں دیکھا۔ اچانک امی چلّا کر بولیں: "ایلیا!" سب لوگ خاموش کھڑے رہ گئے؛ ابّا، بہن اور پڑوسی ام مواد اور ابوسلمان، کسی کے منھ سے ایک لفظ نہ نکلا۔ میں نے خود کو پکار کر کہتے ہوئے پایا "ایلیا؟ ایسی بات مت کہیے۔ نہ نہیں ہو سکتا۔"

ایلیا ایک تقریباً نابینا شخص تھا جو محلے میں گھر گھر پھیرا لگا کر بید کی کرسیوں کی مرمت کیا کرتا تھا۔ جب ہمارے گھر کی باری آتی تو میں اسکول سے واپسی پر اسے گھر کے باہر پتھر کی بنچ پر بیٹھا ہوا دیکھتی اس کے سامنے بید کی لچھیوں کا ڈھیر پڑا ہوتا اور اس کے بال دھوپ میں چمک رہے ہوتے۔ وہ مہارت سے بید کے تار اٹھاتا اور وہ، مچھلیوں کی طرح

Scanned with CamScanner

سوئے ہوئے، جال کے اندر پھنسد جانے میں اسے بےحد مشاقی سے ان کی گول گول لچھیاں بنانے اور پھر ان کے سرے باہر نکالتے دیکھا کرتی۔ یہاں تک کہ وہ کرسی کی گول نشست کو بُن کر پھر ویسا ہی درست کر دیتا جیسی وہ پہلے تھی۔ ہر چیز بالکل ہموار اور درست ہو جاتی۔ یوں لگتا جیسے اس کے ہاتھ مشین ہوں۔ اور میں اس کی انگلیوں کی پھرتی اور مہارت پر حیران رہ جاتی۔ جب وہ سر جھکائے مشغول بیٹھا ہوتا تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ اپنی آنکھوں سے کام لے رہا ہے۔ ایک بار مجھے شک ہوا کہ وہ اپنے سامنے دھندلی شکلوں سے کچھ زیادہ دیکھ سکتا ہے۔ اس لیے میں اس کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اس کے لال گلابی چہرے پر نظر جما کر عینک کے پیچھے چھپی ہوئی آنکھیں دیکھنے میں کامیاب ہو گئی۔ ان آنکھوں میں ایک سفید لکیر تھی جو میرے دل میں چبھنے لگی اور میں جلدی سے بھاگ کر باورچی خانے میں چلی گئی جہاں مجھے میز پر ایک تھیلی میں کھجوریں پڑی ملیں اور میں نے ایک رکابی میں تھوڑی سی کھجوریں رکھ کر ابّا کو دیں۔

میں نظریں جمائے قالین کو گھورتی رہی اور سرخ چہرے اور سرخ بالوں والے ابّا کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے ابھر آئی۔ مجھے اس کے کسی کی مدد کے بغیر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آتے ہوئے زینے کے ہتھے پر اس کا ہاتھ محسوس ہوا۔ پھر میں نے اسے کرسی پر بیٹھے ہوئے محسوس کیا، اپنی اجرت طے کرتے ہوئے۔ پھر جیسے وہ کھانا کھا رہا ہو اور اسے خودبخود پتا چل جائے کہ رکابی خالی ہو گئی ہے۔ آبخورے سے پانی پیتے ہوئے جب پانی آسانی سے اس کے حلق میں اتر رہا ہو۔ ایک دوپہر کو، جب ان کے سکھائے ہوئے طریقے سے کہ کسی کسی مسلمان کے گھر پر دستک دینے سے پہلے بلند آواز میں اللہ کا نام پکارنا چاہیے کہ مبادا امی بےپردہ ہوں، وہ بڑے دروازے پر آیا تو امی سیڑھی سے بڑھیں اور اس سے قالین کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے جواب میں کچھ نہ کہا، بس ایک سسکی سی لی۔ واپس جاتے ہوئے اسے میز سے ٹھوکر لگی اور وہ پہلی مرتبہ الجھ کر گرا۔ میں اس کے پاس گئی اور ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ مجھے میرے ہاتھ کے لمس سے پہچان گیا ہو گا، کیوں کہ اس نے نیم سرگوشی میں مجھ سے کہا، "کوئی بات نہیں، بی بی۔" پھر وہ جانے کے لیے مڑا۔ جب وہ جھک کر جوتے پہن رہا تھا تو مجھے خیال ہوا کہ میں نے اس کے رخساروں پر آنسو دیکھے ہیں۔ ابّا نے اس سے یہ

کہے بغیر اسے جانے نہ دیں کہ "ایلیا! کہ تم سچ کہہ دو تو اللہ تمہیں معاف کر دے گا۔" لیکن ایلیا جنگلے کا سہارا لیے چلتا گیا۔ ٹٹول ٹٹول کر سیڑھیاں اترنے میں اس نے بہت وقت لگایا۔ پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور ہم نے اسے پھر کبھی نہیں دیکھا۔

بہاء طاہر

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

ایک ہوشمند جوان آدمی کی نصیحت

جب وہ ریڈیو سینما کے پاس سے شارع ظلمت حرب کو پار کر رہا تھا، بوڑھا اس کے پیچھے دوڑتا ہوا آیا۔ اس نے چلّا کر اسے پکارا: "عادل بے!" اس نے ایک کار کے اچانک روکے جانے پر ٹائروں کے سڑک پر چرّانے کی تیز آواز سنی پھر ڈرائیور زور زور سے بوڑھے کو برابھلا کہنے لگا، جس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی، اور لپک کر اپنے دوست کو پیادہ رَو تک پہنچنے سے پہلے ہی جا لیا اور اپنی پتلی، دبوچتی ہوئی انگلیوں سے اس کا بازو پکڑ لیا۔ کچھ دیر تک وہ دونوں کچھ بولے بغیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے؛ پھر عادل نے اپنے بازو پر سے اس کا ہاتھ جھٹک کر الگ کر دیا اور اس سے پوچھا: "کیا چاہتے ہو تم؟"

بوڑھا بولا: "یہ میں ہوں، عادل بے، مَیں۔ کیا میں آپ کو یاد نہیں؟ آپ مجھ سے ہر روز الاہرام خریدا کرتے تھے اور ہر ہفتے الکواکب۔ میں آپ کی گلی کے کونے پر کھڑا ہوتا تھا۔ میں حلیل ہوں، آپ کا عمو حلیل۔"

"ہاں،" عادل بے نے کہا، "اور تم، کیا تمھیں یاد نہیں؟ ہم اکثر ملتے رہے ہیں۔ ایک بہت پہلے بھی ہماری ملاقات ہوئی تھی اور میں نے تمھیں کچھ نصیحت کی تھی۔ تمھیں یاد نہیں؟"

وہ آہستہ آہستہ چلنے لگا، اور عمو خلیل اس کے پیچھے پیچھے، اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر، تاکہ بات کرتے ہوئے اس کا بازو چھو سکے۔ "آہ، جناب عالی، مجھے یاد ہے۔ مگر شاید آپ کو معلوم نہیں -- الحمدللہ، میں بدل چکا ہوں۔ آپ میری بات تو سنیے۔ میں بالکل بدل چکا ہوں۔ واللہ، واللہ، اب میرا افیون سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ دیکھیے میں کیسی لگتی ہے اور اس کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ خدا اس بدبخت چیز کو جہنم نصیب کرے!"

عادل پھر رک گیا اور چمکتی ہوئی آنکھوں والا بوڑھا اس کے سامنے آ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چھوٹے چھوٹے قطرے بہنے لگے جن کا اسے کوئی احساس نہ ہوا، اور وہ مسلسل اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔

"یہ تو تم نے مجھے پچھلی بار بھی بتایا تھا،" عادل بولا۔ "تم نے کہا تھا کہ تم نے افیون چھوڑ دی ہے اور کام کرنا چاہتے ہو۔ پھر تم نے کام شروع کیوں نہیں کیا؟" عمو خلیل نے سر جھکا لیا؛ اس کے چھدرے ہوئے ہوئے بالوں کے ساتھ، اور سیاہ گرد سے چمکتی ہوئی بھوری جیکٹ کے چوڑے کندھوں کے درمیان، اس کا سر بہت چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور کہا: "حاج کی صحت کیسی ہے؟ اور آپ کے والد محترم؟ وہ خیریت سے ہیں؟"

عادل ذرا سا ہنسا اور بولا: "خیریت سے ہیں۔"

یہ کہہ کر وہ پھر چل پڑا اور بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا: "دونوں بہت نفیس صاحبان ہیں۔"

بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ کم زور آواز میں بولا: "آپ کو سچ سچ بتاؤں جناب عالی، آج کل میرا علاج چل رہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے مصرے پھیپھڑوں کو سیاہ کر دیا ہے، اللہ اس بدبخت پر لعنت کرے اور اس دن پر بھی جب میں نے اسے منہ لگایا۔ حقیقت یہ ہے جناب عالی، کہ آپ کو خبر نہیں۔ آپ کو اُن دنوں کا عمو خلیل یاد ہے؟ واللہ جناب اُس زمانے میں اپنے کام اور اپنے گھر کے سوا میرا کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اپنے لیے قہوے کا ایک فنجان خریدنے پر بھی میرا دل دکھتا تھا۔ میں خود سے کہتا کہ نہ ایک پیسہ بھی گھر پر خرچ ہو تو بہتر ہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کے ورغلانے پر شروع ہوا۔ انھوں نے مجھے یہ کہہ کر بےوقوف بنایا کہ افیون کنپٹی میں فائدہ کرتی ہے اور مجھے اس کی لت لگ گئی اور سب کچھ برباد

ہو گا۔ مجھے اپنے گھر اور بچوں کی بھی فکر کھائے جا رہی ہے۔ پانچ بچے اور ان کی ماں اور ایک پیسے کا آسرا نہیں۔ یہ آپ کے عمو خلیل پر بہت بڑا بوجھ ہے۔ جناب عالی، ایسی حالت میں آدمی کچھ کرنے کے قابل کہاں رہتا ہے۔ مگر جناب، الحمدللہ، جیسے ہی میرے پھیپھڑوں کا علاج پورا ہوا، اللہ کی مدد سے میں اپنے کام پر واپس آ جاؤں گا۔ مجھ پر مہربانی کیجیے، میں آپ کے پیسے لوٹا دوں گا جیسے ہی... جیسے ہی"

وہ اچانک رکا، پھر اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ عادل کے قدم ڈھیلے پڑ گئے، اس نے سر تھوڑا سا پھیر کر بوڑھے کو دیکھا جو کھانسی کے حملے سے مغلوب، ہجوم میں مطروں سے تقریباً اوجھل کھڑا تھا۔ پھر وہ تیزی سے لپک کر عادل کے دور جانے سے پہلے دوبارہ اس کے پاس پہنچ گیا اور کھانسی سے باربار ٹوٹتی، بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا:

"نہیں، میں پھیپھڑوں کا علاج پورا ہونے سے پہلے کام کرنے کے قابل نہیں ہوں۔ آپ میری تھوڑی سی مدد کر دیجیے۔ میں آپ کے پیسے لوٹا دوں گا۔"

عادل اس کی طرف رخ کیے بغیر آہستہ سے بولا: "تم جھوٹ بول رہے ہو عمو خلیل۔ تمھیں کوئی پھیپھڑوں کا علاج ولاج نہیں کرانا۔ تمھیں صرف اپنی لت پوری کرنی ہے۔ میں نے تمھیں کبھی نہیں سمجھایا ہے؟ پچھلی بار میں نے تمھیں دس پیاسٹر دیے تھے یا نہیں؟ تم نے کیا کیا ان کا؟ افیون پر لگا دیے نا؟"

"دس پیاسٹر؟" بوڑھے نے احتجاج کیا۔ "واللہ، عادل بے، دس پیاسٹر میں نے... جناب عالی، میں آپ کو بتا چکا ہوں، افیون کا قصہ ختم ہو چکا... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ افیون کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا... اگر حضور میرے ساتھ چلنے کی زحمت کریں..."

جوان آدمی سڑک پر چلتے چلتے رک گیا اور مضبوط، بےصبر لہجے میں بولا: "دیکھو میں تم سے صرف ایک بات کہتا ہوں: تمھیں اپنا علاج کرانا ہو گا۔ اسپتال جاؤ تاکہ تمھارا علاج ہو سکے۔ اگر تمھیں کسی بااثر شخص کا حوالہ چاہیے تو میرا ایک دوست ڈاکٹر ہے، میں اس سے کہوں گا کہ وہ..."

بوڑھے نے ہاتھ بڑھا کر پھر عادل کا بازو پکڑ لیا۔

"حبیبی،" وہ تیزی سے بولا۔ "ابھی۔ میں اسی وقت آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ خدا آپ پر مہربان ہو۔ مجھے ابھی اپنے ڈاکٹر دوست کے پاس لے چلیے۔"

Scanned with CamScanner

عادل تذبذب کے عالم میں بوڑھے کو دیکھنے لگا جو اس کا بازو پکڑے کھڑا کانپ رہا تھا اور سوچنے لگا کہ اس سے کیا کہے۔ مگر اس کے کچھ بولنے سے پہلے بوڑھا کہنے لگا، "مگر عادل بے، ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے میں اپنے بچوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنے بچوں کو دیکھنا ہو گا، ان کے کچھ بندوبست کرنا ہو گا۔ وہ بالکل بےآسرا ہیں، جناب عالی۔ میں اسپتال چلا گیا تو انہیں کون سنبھالے گا؟ میں آپ سے پوچھتا ہوں۔ میری اس بات کو معاف کیجیے گا، کیا آپ چاہتے ہیں کہ ان کی ماں عصمت فروشی کر کے ان کا پیٹ پالے؟ کیا آپ کو اس سے خوشی ہو گی، عادل بے؟ کیا آپ کو خوشی ہو گی؟ میں۔۔ دراصل میں بے آپ کو بتانا نہیں۔۔۔ میں اسپتال نہیں گیا تھا۔ میں نے خود اپنا علاج کیا، اور الحمدللہ، میں اب ٹھیک ہوں۔ اب صرف پھیپھڑوں کا اور کھانسی کا مسئلہ رہ گیا ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس صرف اس لیے جانا چاہتا ہوں کہ وہ میرے پھیپھڑوں کا معائنہ کر لے، بھی ایکسرے وغیرہ۔ مجھ پر تھوڑی سی مہربانی کر دیجیے، عادل بے۔ صرف ڈاکٹر کی فیس۔"

وہ دونوں سڑک کے ایک پُرہجوم حصے میں عامی سینما کے سامنے کھڑے تھے، اور لوگ انہیں دھکیل کر راستا بناتے ہوئے گزر رہے تھے۔ عادل نے خود کو سینما میں دکھائی جانے والی فلم کی تشہیر کے واسطے لگائی ہوئی تصویروں کے بالکل سامنے پایا، اور اسے احساس ہوا کہ وہ کچھ دیر سے فلم کی خوب صورت ہیروئن کی تصویر کو گھور رہا ہے جس میں اسے بےترتیب بالوں اور اوپر کو اٹھی ہوئی ران پر سے سرکے ہوئے لباس کے ساتھ نیم دراز حالت میں دکھایا گیا تھا۔ اسے احساس ہوا کہ اس بے عمو جلیل کی بات سنی ہی نہیں۔ اس کا خیال آتے ہی اس نے جھٹکا دے کر اپنا بازو چھڑایا اور بولا،

"مجھے جو کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔"

جب وہ یہ کہہ کر آگے بڑھا تو بوڑھے نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کسی ایسے شخص کی طرح سر ہلایا جس پر کسی بات کا انکشاف ہو گیا ہو۔ وہ بولا، "میں سمجھتا ہوں، عادل بے۔ آپ میرے بارے میں فکرمند ہیں۔ آپ کو اپنے عمو جلیل کی طرف سے تشویش ہے، مگر، جیسا کہ میں نے کہا، الحمدللہ میں نے کام ڈھونڈ لیا ہے۔ میں اخباروں کا کھوکھا لگاؤں گا، اپنے پرانے کام پر واپس چلا جاؤں گا۔ اللہ نے چاہا تو پہلے سے بھی بہتر ہو جاؤں

گا۔" پھر اس نے دبی ہوئی آواز میں کہا، "مجھے صاف صاف بات کرنی چاہیے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ نہیں۔ میری تھوڑی سی مدد کر دیجیے۔ صرف اتنا جس سے بچوں کی خوراک کا انتظام ہو سکے۔"

"تمھیں بچوں سے کیا غرض؟" عادل طیش میں آ کر بولا۔ "تمھیں صرف اپنے بدبخت نشے سے مطلب ہے۔"

"نشےباز بھی آخر انسان ہوتا ہے۔" بوڑھا بولا، "جناب عالی، مجھے بھی اپنے بچوں سے محبت ہے۔"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" عادل نے کہا۔ "جو شخص اپنے کام اور اپنے گھر کو چھوڑ دے، صرف اس لیے کہ... میں نے تمھیں کتنی بار بتایا ہے؟ مجھے دیکھو۔ میں انجینئر ہوں۔ دن رات کام کرتا ہوں، دن میں سرکاری ملازمت اور رات کو ایک کمپنی میں۔ پیسا کمانے کے لیے خود کو ہلاک کیے دے رہا ہوں۔ کیوں؟ کیا میں نے اپنے لیے گاڑی خریدی تاکہ بسوں میں آنے جانے کی دقت سے بچ سکوں؟ ہرگز نہیں۔ اپنا کمایا ہوا ایک ایک پیسا بچا کر رکھتا ہوں تاکہ میرے بیٹے کا مستقبل محفوظ ہو سکے۔ ابھی وہ نرسری اسکول میں ہے لیکن آدمی کو مستقبل کی فکر کرنی ہی پڑتی ہے، عمو خلیل۔ کسے پتا کتنے بچے اور ہوں گے؟ پہلے آدمی کو مستقبل کا بندوبست کرنا چاہیے پھر اس بارے میں سوچنا چاہیے۔ تم نصیحت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے، عمو خلیل؟ اور لوگوں کو دیکھو۔ خود مجھے دیکھو۔"

بوڑھا اس کی باتیں سنتے ہوئے رضامندی سے سر ہلائے جا رہا تھا مگر اس کی آنکھیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں اور ظاہر کر رہی تھیں کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے ذرا بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا۔ جب عادل خاموش ہوا تو اس نے کہا "بالکل درست ہے، جناب۔ الحمدللہ جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، اللہ کے فضل سے اب میں صحت یاب ہو چکا ہوں۔" پھر اس نے اچانک ایک چھوٹا سا قہقہہ لگایا۔ "آپ اتنے سے تھے جب مجھ سے اپنے ابا کے لیے اخبار لیا کرتے تھے۔ عمو خلیل، الاہرام! یاد ہے؟" اس نے ایک بار پھر رک کر عادل کا بازو پکڑ لیا۔

"مجھ پر ترس کھائیے عادل بے، میں آپ کا ہاتھ چومتا ہوں۔"

انجینئر نے سختی سے اپنا بازو چھڑا لیا۔ "یہ باتیں بہت ہو چکیں۔" پھر وہ تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بوڑھا اس کے پیچھے پیچھے لپکتا اور کہتا رہا "تھوڑی سی مدد عادل بے، کچھ بھی..."

Scanned with CamScanner

"ہوش کی دوا کرو اور اپنے بچوں کے پاس جاؤ۔"

"میں ہوش سے کام لوں گا، عادل نے۔ واللہ، جو آپ کہیں گے وہی کروں گا۔ آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے بچوں کو نرسری اسکول میں داخل کراؤں، ہے نا؟ کراؤں گا، ضرور کراؤں گا، مگر اس وقت مجھے تھوڑی سی مدد کی ضرورت ہے، میں۔۔۔"

بوڑھے نے پھر ہاتھ بڑھایا اور عادل کا کندھا پکڑ کر تقریباً زبردستی اسے روک لیا۔ پھر وہ اپنا چہرہ اس کے بالکل سامنے لے آیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور چہرے کی سلیں بار بار پھڑک رہی تھیں۔

"سنیے،" وہ سرگوشی میں بولا، "ڈھونگ رچانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کو اپنے عمو جلیل سے شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جوان ہیں اور میں آپ کے کام آنا چاہتا ہوں۔ کچھ مت کہیے، فقط میری بات سنیے۔ اپنی کی بات ہے، میں ایک عورت کو جانتا ہوں جو بیحد حسین ہے۔ نہیں نہیں، بولنے کی ضرورت نہیں۔ آخر جوانی ایک ہی بار ملتی ہے، اس سے لطف اندوز ہونا چاہیے۔ میں سچ کہتا ہوں -- بےحد حسین۔ مجھے صرف جا کر اسے آپ کے پاس لانا ہو گا۔ کچھ مت کہیے، آپ کا عمو جلیل آپ کے کام آنا چاہتا ہے۔"

"پاگل ہو گئے ہو کیا؟" عادل نے کہا

"میری بات سنیے،" بوڑھا بولا، "میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ ہمیشہ زندگی سے لطف اندوز ہونے کے قائل رہے ہیں۔ میں نے بارہا آپ کو مختلف لڑکیوں کے ساتھ دیکھا ہے اور کبھی اپنے منہ سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ دیکھیے، آپ کے عمو جلیل کی زبان ہمیشہ بند رہتی ہے۔ نہیں، کچھ مت کہیے۔"

بوڑھے نے اپنے منہ پر انگلی رکھ لی، پھر ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں پونچھیں، اگرچہ اس کے پچکے ہوئے رخسار پہلے کی طرح گیلے رہے۔ دھیمی آواز میں سرگوشی کرتے ہوئے وہ دبی دبی کھوکھلی ہنسی ہنستا رہا۔

"میں کبھی اپنی زبان نہیں کھولتا، کیونکہ مجھے وہ لوگ پسند ہیں جو راز کو راز رکھنا جانتے ہیں۔ میں آپ سے کچھ نہیں چاہتا، فقط ٹیکسی کا کرایہ، مجھے بس جا کر آپ کے پاس لانا ہو گا۔ آپ نے اپنے عمو جلیل سے تسلی کا ایک لفظ بھی نہیں کہا مگر کوئی بات نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے؟ آپ میرے بیٹوں کی طرح ہیں۔۔۔ دنیا میں کسی اور شخص کے لئے میں یہ کام نہیں کروں گا، لیکن اگر آپ اپنے عمو جلیل کی مدد کرنا چاہیں۔۔۔ دیکھیے،

میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا فقط ٹیکسی کا کرایہ مسیے، اگر آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں تو میرا شناختی کارڈ رکھ لیجیے۔"

وہ کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے اپنی جیکٹ کی اندرونی جیبیں ٹٹولنے لگا اور اس کی آنکھوں سے تازہ آنسو بہنے لگے۔

"تم ایسا کر چکے ہو؟" انجینئر بولا۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ تمہیں موت آ جاتی۔"

وہ اسے چھوڑ کر تیزی سے چل دیا، تقریباً دوڑنے لگا۔ بوڑھا جو اب تک اپنا شناختی کارڈ تلاش کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا اپنی جگہ پر کھڑا رہ گیا۔ اس نے اس کی طرف دیکھ کر کارڈ ہلایا اور کہا

"آئیے، عادل بے، آپ میری بات نہیں سمجھے۔ آپ نہیں سمجھے۔"

جب بوڑھے نے اسے دوبارہ سڑک پار کرتے دیکھا تو اس کی طرف دوڑا۔ جب بریک کے زور سے چرچرانے کی آواز آئی اور سڑک کے درمیان کوئی بہت بھاری چیز اس سے ٹکرائی تو وہ زمین پر گر گیا۔ اس کا اوپر کا دھڑ زمین سے بلند ہوا، اس کے منہ سے ایک کراہ نکلی اور وہ بازو پھیلائے دوبارہ گر پڑا، کارڈ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر اس کے پاس گر گیا۔

یہ غروب کے بعد کا وقت تھا جب تاریکی کا غلبہ ہونے سے پہلے روشنی آخری بار اپنی چمک دکھاتی ہے۔ سفید کار کے ڈرائیور نے جب سفید بالوں اور کھلی ہوئی آنکھوں والے بوڑھے کے گرد راہ گیروں کو اکٹھا ہوتے دیکھا تو گھبرا کر نیچے اتر آیا۔ کوئی بولا: "ابھی ذرا دیر پہلے یہ کسی آدمی سے بات کر رہا تھا۔" کسی دوسرے نے کہا: "ہاں، ایک جوان آدمی تھا، میں نے اسے ابھی ابھی سڑک پار کرتے دیکھا ہے۔" مگر جب انہوں نے اردگرد نظریں دوڑا کر اس جوان آدمی کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو وہ انہیں نہیں ملا۔

اس نے بھی حادثہ ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور ادھر آنے کے لیے پلٹا تھا۔ مگر پھر اچانک رک گیا تھا، خود سے کہا تھا "وہ میرا نام گواہوں میں لکھ لیں گے اور بلاوجہ مجھے روکے رکھیں گے؛ اور مجھے پہلے ہی کمپنی پہنچنے کو دیر ہو رہی ہے۔" پھر وہ تیزی سے اس گلی میں مڑ گیا تھا جس کے نکڑ تک پہنچ چکا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے پھر رک کر واپسی کا ارادہ کیا تھا، مگر پھر خود سے کہا تھا: "اگر وہ زخمی ہوا ہے تو یہ لوگ اس کا علاج کرائیں گے اور شاید اسے کچھ معاوضہ بھی مل جائے، اور اگر مر گیا ہے تو پھر کیا کیا جا سکتا ہے؟ شاید اس کے بچوں کو معاوضہ مل جائے اور ان کا

Scanned with CamScanner

گزارا ہو سکے۔" اگرچہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، وہ تیز تیز چلنے لگی اور پھر نہیں رکا۔

کسی نے جھک کر بوڑھے کا کارڈ اٹھایا۔ اس نے اس کا معائنہ کیا، بوڑھے کا نام پڑھا، اس کے بچوں کے نام پڑھے، اور پھر کارڈ پولیس کے سپاہی کو تھما دیا جو خاموشی سے کار کے ڈرائیور کی بات سن رہا تھا۔ ڈرائیور اسے سمجھا رہا تھا کہ حادثہ کیسے پیش آیا؛ اس نے دونوں ہاتھوں سے پہلے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا، پھر انہیں مرے ہوئے آدمی کی جانب لہرایا جسے وہ نہیں دیکھ رہا تھا۔

محمود دیاب

انگریزی سے ترجمہ : عطا صدیقی

ایک گھر اپنی اولاد کے لیے

یہ تو خیر ممکن ہی نہیں کہ یہ خیال مجھے وقت کے وقت سُوجھ گیا ہو کہ میں تو مدت سے ایک دائمی مکان کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ گو خوابوں میں اس کے خدوخال کچھ ایسے زیادہ صاف نظر نہیں آتے تھے، مگر اس کا ایک امتیازی وصف یہ تھا کہ اس پر حرارت اور راحت کی ایک فضا سی محیط رہتی۔ چنانچہ جیسے ہی مجھے موقع میسر آیا، میں نے اس کو فی الفور ایسے جھپٹ لیا جیسے میرا جینا اسی پر منحصر ہو۔

خود میرے لیے یہ سودا کوئی اتفاقی امر نہیں تھا مگر میری بیوی کے لیے یہ کچھ ایسا حیران کن تھا کہ وہ مارے خوشی کے اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ دراصل میں نے خالی حویلی پرانی قلعے کے بجائے شہر کے مشرقی علاقے میں قائم کی گئی ایک نئی رہائشی بستی کے ایک خالی پلاٹ کے حقیقی بیع نامے کی شکل میں اپنی بیوی کی حیرت کا سامان کیا تھا ورنہ پھر اس میں گرم جوشی پیدا نہ ہوتی۔

یہ اُس دن کی بات ہے جس دن ہمارے بچّوں، ہالہ اور ہشام، کی سالگرہ تھی۔ ہماری بیٹی کی عمر چار سال اور بیٹے کی دس سال تھی۔ دونوں کی پیدائش ایک ہی ماہ کی تھی، گو تاریخیں جدا جدا تھیں اس لیے ہم دونوں

کی سال گرہ ایک ہی دن منایا کرتے تھے۔

اس دن گھر پہنچنے پر بیوی نے پوچھا "کیا بھول گئے تھے کہ بچوں کی سال گرہ ہے؟"

"نہیں تو، بھولا تو نہیں،" میں نے اپنی بےچینی کو چھپاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ تمھارے پلّے کچھ بھی نہیں،" اس نے چھیڑتا کہا

"نہیں نہیں، میں قلّاش نہیں ہوں۔"

"ایک وہ ہیں کہ کب سے تمھارا انتظار کر رہے ہیں اور ایک تم ہو کہ تم نے ان کے واسطے ایک پیاسر کی مٹھائی بھی لانا گوارا نہیں کیا،" اس نے میرے خالی ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"ان کو خالی خولی مٹھائیاں اور کھلونے دلانے سے اب میں بیزار ، گیا ہوں،" حیرت پیدا کرنے کی خاطر اس سے بہتر تمہید باندھنے میں ناکام ہو کر میں نے اپنی بغل میں دبا بڑا سا لفافہ نکالا اور بیوی کے حوالے کر دیا۔

"میرا تحفہ اس لفافے میں ہے،" میں نے اسے بتایا۔ اس نے کاغذات نکالے اور ان پر نظر دوڑانے لگی، اور میں اپنی اس توفیق پر اتراتے ہوئے اس پر نظریں گاڑے رہا۔ ایک نظر ان دستاویزات کی اصلیت کو پانے میں ناکام ہو کر اس نے سوالیہ انداز میں اپنا حسین چہرہ اٹھایا اور چیخی، "یہ کیا ہے؟"

"ان کے لیے ایک گھر،" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بسام پیچھے سے آیا اور میری ٹانگوں میں اپنا منھ دے کر دھیمے دھیمے ہنسنے لگا۔ میں نے جھک کر اس کو اٹھا لیا اور اپنی بیوی پر ہونے والے غیرمتوقع ردعمل سے بالکل بےخبر اپنے بیٹے کو پیار کرنے لگا۔

اس پل کے بعد بیوی کا تو رنگ ہی بدل گیا۔ حد یہ ہے کہ اس نے میری محبّت کا وہ پرانا قصّہ چھیڑا ہی نہیں جس سے وہ چند دن پہلے واقف ہو چکی تھی۔ پتا نہیں اس نے اسے بھلا دیا تھا یا جان بوجھ کر نظرانداز کر دیا تھا۔ بلکہ وہ تو نہایت نرم خُو اور ہشاش بشاش ہو گئی اور شاید ہی ہمارا کوئی عزیز یا جاننےوالا بچا ہو جس کو اس نے یہ نہ بتایا ہو کہ ہم اپنا مکان بنانے جا رہے ہیں۔ اصل میں اس کو تو اب مکان کے سوا کوئی اور بات کرنے میں لطف ہی نہیں آتا تھا۔

٭

ایک دن ہم چاروں اپنا پلاٹ دیکھنے گئے، یعنی بقول اس کے "موقعے پر

معائنہ کریں"۔ ہم پلاٹ کے ایک کونے میں جا کھڑے ہوئے۔ وہ میرے پاس کھڑی مارے خوشی کے پھولی نہ سما رہی تھی۔ دونوں بچے قریب ہی خوش خوش دوڑیں لگا رہے تھے، شور مچا رہے تھے اور گردوغبار کے چھوٹے چھوٹے مرغولے اڑا رہے تھے۔

میری بیوی بتائے جا رہی تھی کہ مکان کس طرح کا ہو گا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے باربار دوہرا رہی تھی "ایک منزلہ ہو گا، ہے نا؟ جب بچے بڑے ہو جائیں گے تو ہم ایک منزل اور چڑھا لیں گے۔ ہم اس کو بڑے باغ سے گھیر دیں گے۔ اس کی دیکھ بھال میں خود کروں گی۔ میں اس کو پھولوں سے پاٹ دوں گی۔ تمھیں کس طرح کے پھول پسند ہیں، جی؟ ہے نا ہنسی کی بات کہ پانچ برسوں میں میں یہ بھی نہ جان پائی کہ تمھیں کون سا پھول پسند ہے۔"

"مجھے چنبیلی پسند ہے۔"

"ہم باغ کو چنبیلی سے پاٹ دیں گے۔" وہ چلائی۔ پھر بولنے لگی: "شہر کے شور اور دھوئیں سے دور اس قسم کے مکان کی رہائش بچوں کی صحت کے لیے بہت اچھی رہے گی۔ میرے دادا کا مصورہ میں بہت پیارا سا گھر تھا۔ ایک مکڑی کا تو باغ ہی تھا اس میں۔ ذرا سوچو! اور ہاں، اوپر کپڑے دھونے کے لیے کوئی جگہ ضرور نکالنا، اور ایک کمرہ ملازموں کے لیے بھی۔۔۔"

"ملازموں کے کمرے سے کیا مطلب ہے تمھارا؟" میں نے اسے ٹوکا "میں نے تو اپنی زندگی کے قیمتی سال اس خواب کو حقیقت بنانے میں لگا دیے، اب میں تم سے درخواست کروں گا کہ اس کو فضولیات میں تو نہ بدلو۔"

"اچھا اچھا، اور گیراج؟ بنگلے میں گیراج تو ہونا ہی چاہیے۔"

"مگر میرے پاس کار کہاں؟"

"کبھی تو کار ہو گی۔ جو گیراج نہ ہو گا تو کہاں رکھو گے بھلا؟" اس نے پکار کر منی سے کہا کہ اپنے بھائی کو لے کر آ جائے، اور پھر وہ خود سکھ سا بھپ لگاتی بچوں کے پیچھے کسی کم سن لڑکی کی طرح دوڑیں لگانے لگی۔

ان سبوں کو پلاٹ کے بیچوں بیچ اس حالت میں دیکھتے دیکھتے میرا دھیان بھٹک کر بہت دور نکل گیا اور پھر اسی وقت پتا چلا جب میری بیوی پلٹ کر میرے پاس آ کھڑی ہوئی اور دوبارہ اپنی باتیں کلی پھندنے لگ کر دوہرانے لگی اور میں اپنے دھیان میں کھویا ہوا تھا ۔۔ نہیں، میں اس کی

باتوں کا جواب دیتا رہا تھا۔

زمان و مقام سے بہت دور مجھ کو ایک پُرانا گھر یاد آ گیا۔ معلوم تو نہ سہی تاہم وہ کب زمانہ تو اس کا اندازہ میں اپنی عمر سے لگا سکتا ہوں۔ میں اُس وقت آٹھ نو برس کا تھا۔ اس بستی میں ہمارا مکان تھا، معمولی سا ایک منزلہ مکان جس کے چاراطراف ایک مختصر مگر خوب صورت سا باغیچہ تھا۔ بہرحال اس میں ملازموں کے لیے کوئی کمرہ نہیں تھا کیوں کہ ہمارے پاس ملازم ہی نہیں تھے، نہ ہی اس میں کوئی گراج تھا کیوں کہ میرے ابا نے اپنی زندگی میں کبھی کسی دانی کار میں قدم ہی نہیں رکھا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہمارے باغیچے میں انگوروں کی ایک ٹٹی تھی، آم کے دو پیڑ تھے، لیموں کا ایک جھاڑ تھا اور مرغیوں کے لیے ایک بڑا سا دڑبہ تھا۔ مجھ کو یہ بھی یاد ہے کہ ابا کو گھر میں آئے ایک منٹ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کھُرپی اٹھا کر باغیچے میں کام سے لگ جاتے تھے جس کی باڑھ چنبیلی کی جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ مجھ کو یہ یاد نہیں کہ ہم اس مکان کے مالک کب سے تھے یا کب اس میں بودوباش اختیار کی تھی؛ پر اتنا یاد ہے کہ ابا کو اس پر بےانتہا ناز تھا اور میری امی اس کی ملکیت میں آنے کو ایک عظیم الشان تاریخی واقعہ سمجھتی تھیں۔ چناں چہ انھوں نے اس کو خود اپنی اور اپنے کنبے کی زندگی کے دیگر واقعات کا صحیح وقت متعیّن کرنے کا پیمانہ بنا لیا تھا۔ کئی بار میں نے ان کو کہتے سنا: "جب ہم اس مکان میں اترے اُس وقت فلاں پیٹ میں تھا"، یا "جب ہم نے یہ مکان خریدا تو میرے میاں کی تنخواہ اتنی تھی"، اور اسی طرح کی اور باتیں جن کو یاد کر کے میں اب بھی مسکرا اٹھتا ہوں۔

مجھ کو اُس زمانے کے کوئی خاص واقعات تو اب یاد نہیں رہے سوائے اپنے ایک بھائی کی ولادت کے جو ہم سب میں پانچواں اور ترتیب اولاد میں تیسرا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر واقعات اتنے غیراہم تھے کہ انھوں نے میرے دماغ پر کوئی نقش نہیں چھوڑا، لیکن مجھ کو یہ یاد رہا کہ جب شام ہو جاتی تھی تو ہمسایوں کی ٹولی میرے ابا سے ملنے آ جاتی تھی اور وہ سب باغیچے میں بیٹھ کر مختلف موضوعات پر خوش گپیاں کیا کرتے تھے جب کہ ہم بچے ان کے آس پاس کھیلتے رہتے اور بادِ بہاری چنبیلی کی مہک سے بوجھل ہو کر نشے میں جھومتی پھرتی۔ ممکن ہے اس وقت ہمارے گھر میں [illegible] تھا، یہی رہا کرتی ہو، کہ میں اب اس زمانے کو بہتر سمجھتے

۷۔ مہینوں اور جنتری کی جستجو کے بعد بھی نہیں کر پاتا۔

پھر کچھ ایسے واقعات رونما ہونے لگے جنھوں نے گو ہماری زندگی کی یکسانیت کو یک دم درہم برہم نہیں کیا، اس وجہ سے وہ مجھ کو پوری تفصیل کے ساتھ تو مشکل ہی سے یاد آتے ہیں، ہاں ان کی مبہم سی یادیں ضرور آ جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ لفظ "جنگ" انھی دنوں کانوں میں پڑنا شروع ہوا تھا جو میرے لیے ایک نیا لفظ تھا اور اس وقت گھر میں لفظ "روٹی" کی نسبت کہیں زیادہ استعمال کیا جانے لگا تھا۔ ہماری گلی کے بڑے بوڑھے بھی اس پر بہت پریشان ہونے لگے تھے جب کہ میں اس کے معنی بھی نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح کے اور بھی کئی الفاظ تھے جو جنگی اور مشکل ہونے کے باوجود صرف بار بار سنے جانے کی بنا پر مجھے ازبر ہو گئے۔۔ اتحادی، محوری، جرمن، جاپانی، مولوٹوف اور نہ جانے کتنے جو سب کے سب میرے لیے محض ایسے الفاظ تھے جو میرے کان میں پڑتے رہتے تھے۔

ابا اور ہمارے ہمسائے باغیچے میں بیٹھ کر انھی سب پر باتیں کیا کرتے اور باتوں ہی باتوں میں دو گروہوں میں بٹ جاتے۔ ایک انگریزوں کی فتح کا خواہاں ہوتا تو دوسرا جرمنوں کی کامیابی کا دعاگو۔ میرے ابا کا تعلق جرمن نواز گروہ سے تھا اس لیے میں بھی جرمنوں کی کامیابی کی دعا مانگ لیتا۔ جب میں بڑا ہوا تو مجھے سمجھ آیا کہ جرمنوں کی فتح کا مطلب ہے انگریزوں کا ملک سے نکلنا۔ اگرچہ ہمارے ساتھ والے ہمسائے چچا جان کو یقین تھا کہ اگر انگریزوں نے ملک خالی کیا تو اس کا مطلب ہوگا کہ جرمن اس میں گھس آئیں گے۔ بڑے اسی طرح دیر تک اپنی زوردار بحث مباحثہ جاری رکھتے جو ایک رات کو جہاں ختم ہوتی دوسری رات کو وہیں سے پھر شروع ہو جاتی۔ ادھر ہم بچے گلی میں دو ٹولیوں میں بٹ جایا کرتے۔ ایک انگریز تو دوسری جرمن۔ ظاہر ہے میں دوسری ٹولی سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر ہم اپنی نقلی جنگوں میں جت جاتے جس کی وجہ سے آخرکار ہم سب ہانپتے کانپتے تھک تھک کر چور ہو جاتے تھے۔

جب سونے کا وقت ہو جاتا تو میں اپنے بستر میں جا گھستا اور کچھ دیر تک باغیچے سے ان بزرگوں کی آوازیں سنا کرتا جن میں میں ابا کی آواز تو الگ سے پہچان لیتا۔ پھر سوتے سوتے اپنے ذہن میں جرمنوں کی صورت گری میں لگ جاتا۔ میرے تصور میں جرمن نہ تو انگریزوں کے سے ڈیل ڈول کے ہوتے اور نہ ہی ان کی سی شکل صورت کے بلکہ وہ مجھے تو ان سے کہیں زیادہ

لمبے تڑنگے اور شان دار نظر آتے۔

ایک رات ہوائی حملے کا سائرن بج اٹھا۔ یہ بھی اُس زمانے کی ایک نئی اور دل چسپ چیز تھی۔ گلی کوچوں اور گھروں کی بتیاں بجھ گئی تھیں اور ہرسُو گہری خاموشی سے بوجھل اندھیرے کی عملداری ہو گئی تھی۔ دروازوں پر آسیبی ہیولے سے جمع ہو گئے تھے اور چنبیلی کی تیز مہک گزری ہوئی راتوں کی بہ نسبت کچھ زیادہ ہی پھیلی ہوئی تھی۔

"جرمن ہوائی جہاز" ابّا چلّائے۔ آسمان پر نظریں جمائے اور پوری توجہ سے کان لگائے میں اُس بےہنگم بھنبھناہٹ کا اندازہ لگا سکتا تھا جو افق کے اُس پار سے گھٹاٹوپ اندھیرے کو چیرتی ہوئی قریب آ رہی تھی۔

"کیا وہ بستی پر بمباری کریں گے؟" میں نے دہشت زدہ ہو کر امّی سے پوچھا۔

"نہیں،" ابّا نے ایک ایسے شخص کی طرح مطلع کیا جو اس قسم کے معاملات سے اچھی طرح واقف ہو۔ "ہٹلر ایسا نہیں کرے گا۔ وہ تو بس انگریزوں کی چھاونی کی طرف جا رہے ہیں۔"

انگریزوں کی چھاونی ہمارے چھوٹے سے شہر کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھی، بلکہ تقریباً آ ملی تھی۔ ہم نے بیست ناک دھماکے سے جنھوں نے مجھے نہیں پتہ کہ ختم ہونے کا نام بھی لیا ہو۔ ایک ہوائی جہاز آسمان ہی میں پھٹ کر شعلہ جوالہ بن گیا۔ پھر آسیبی ہیولے اپنی بھاری بھاری چاپ کے ساتھ ہجوم کرنے لوگوں کو یہ بتاتے ہوئے گزرے کہ جہاز بستی کو برباد کیے دے رہے ہیں اور مشورہ دینے لگے کہ لوگ اپنے گھروں سے دور دور رہیں۔

آسیبی ہیولوں کے پرے کے پرے گرتے پڑتے گلی کوچوں میں نکل بھاگے۔ ہمارے والدین بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سب کو جلدی جلدی سمیٹ کر خوف زدہ اژدہام کے ساتھ اس صحرا کی جانب نکال لے گئے جو بستی کے شمال مشرق میں پھیلا ہوا تھا۔ آس پاس پناہ کے لیے کوئی اور جگہ ہی نہیں تھی۔

وہ رات قیامت سے کم نہ لگتی تھی۔ ابّا اس کو اسی طرح بیان کرتے تھے اور بعد میں امّی بھی ان کے یہی الفاظ دوہرایا کرتیں۔ لوگ وحشیوں کی طرح آپس میں دھکم پیل کر رہے تھے اور ننگے پاؤں اپنے گھر کے باسیوں میں اس گھپ اندھیرے میں ایک دوسرے کو آوازیں دیتے بھاگے چلے جا رہے تھے۔ "محسن تم کہاں ہو؟"، "بچے کہاں ہیں؟" "دروازہ لگ دیا تھا؟"، "گھر کی

Scanned with CamScanner

جھونپڑی جہنم میں۔ جلدی کرو۔" ابا "ذرا رکو تو" اور کہتے تھے کہ چہار جانب سے جھونکے چلے جا رہے تھے۔ میں اپنے ننھے بھائی بہنوں کے ساتھ بھاگتے ہوئے رو بھی رہا تھا۔ اس گھپ اندھیرے میں آہ و بکا کرنے والوں میں بچوں کی اکثریت تھی۔

یہ تو میں نہیں بتا سکتا کہ اس ابتری کی رات میں کتنی ساری خلقت نے اس صحرا میں پناہ لے رکھی تھی! بس یہ جانتا ہوں کہ وہ تاریک رات گزار لوگوں سے اس طرح پٹ پڑا تھا جیسے ہم سب کسی بزرگ کے عرس میں آئے ہوئے ہوں، جیسا کہ چچا حسن نے زہرخند کے ساتھ کہا تھا "شیخ بنلو کے عرس میں۔"

"زمین کھودنے میں میرا ہاتھ بٹاؤ" ابا نے امی سے اس قسم کے امور کے کسی ماہر کے لہجے میں کہا تھا۔ "جلدی جلدی کھودو۔ حسن آفندی اپنے بچوں کے لیے ایک خندق بنا لو تاکہ گولوں کے اڑتے ہوئے ٹکڑوں کی زد سے محفوظ رہیں۔"

ہم نے مل کر ایک بڑی سی خندق کھودی جس میں ابا نے ہم سب کو لٹا کر بھر دیا۔ اس دوران بستی پر پے در پے دھماکوں پر دھماکے ہوتے رہے اور آسمان پر بے ہنگم گھن گرج چھائی رہی۔ اوپر آسمان میں بجلی کی طرح وقفے وقفے سے روشنی کے جھماکے ہوتے رہے اور پھر ہوائی جہاز ہمارے اوپر منڈلانے لگے۔

"بالکل ہمارے سروں پر آ گئے ہیں" ابا چلائے۔ امی نے ایک دل دوز چیخ ماری اور ہم سب کو چھپا لینے کے لیے ہمارے اوپر اوندھی گئیں۔ ابا نے بھی یہی کیا۔ پورے صحرا میں لوگوں کو خاموش کرنے کے لیے آوازیں گونجنے لگیں۔ جواب میں ان کو چپ کرنے کے لیے کچھ دوسری آوازیں بلند ہو گئیں۔

میں نے اپنی گردن اچکا کر سر اوپر کو اٹھایا اور ان کی بغل میں سے آسمان کی طرف دیکھا کہ شاید کسی ہوائی جہاز میں کوئی جرمن دکھائی دے جائے اور میں اپنے تصور میں بنائی ہوئی جرمنوں کی شکل کی تصدیق کر سکوں۔ مگر ابا نے زور سے دبا کر میرا سر ریت میں دبا دیا۔

"اگر ان کی لڑائی انگریزوں سے ہے تو آخر ہم پر بمباری کیوں کر رہے ہیں؟" میں نے سرگوشی کی۔ ابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"کیا ہم ان کے رفیق نہیں ہیں؟" میں نے سوال کیا۔

"دونوں پر اللہ کی لعنت!" ابّا زور سے چیخے۔

ہوائی جہاز زمین کے اتنے قریب آ گئے تھے کہ ان کی تھرتھراہٹوں نے مجھ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پھر یکایک خوفناک روشنی کے جھماکوں نے سنّاٹاں سی مچاتے ہوئے تاریک صحرا کو بےساس کر دیا اور پھر تو جیسا کہ چچا حسن کی بیوی نے، جو اس رات دو برس کے بعد ہم کو ملی تھیں، بیان کیا تھا: "لوگوں پر بارش کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی"۔

زمین سے بلند ہوتی ہوئی چیخوں نے آسمان سے آتے ہوئے دھماکوں کے ساتھ مل کر شور اور واویلا کا اس قدر ہنگامہ گرم کیا کہ اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی وہ اب تک میرے کانوں میں گونجتا ہے۔ جب پَو پھٹی تو امّی نے اس پاس کی دوسری عورتوں کی طرح خود کو جنونی دوروں کے حوالے کر دیا اور ان کو آپے میں لانے کی ابّا کی ہر کوشش بےکار گئی۔

آخرکار یہ قتل عام بند ہوا۔ آسمان سے ہوائی جہاز معدوم ہو گئے اور اوپر سے آتی ہوئی مسموم آوازوں اور دھماکوں نے بند ہو کر زمین کے وحشیانہ شوروغوغا کے لیے جگہ خالی چھوڑ دی جو اس وقت تک جاری رہا جب تک دن کی روشنی کا اوّلیں ڈورا نمودار نہ ہو گیا۔

تکان سے چُور چُور ہم سب اپنی خندق سے نکلے تھے اور اپنے والدین کے پیچھے پیچھے چل دیے تھے۔ ان کے حکم پر ہم نے اپنی آنکھیں کس کر میچ رکھی تھیں تاکہ ہماری نظر گردوپیش کے خون خرابے پر نہ پڑ جائے۔ ہم نے سیدھے اپنے گھر کی راہ لی، مگر وہ وہاں موجود نہ تھا۔ ہماری گلی میں نہ چچا حسن کا گھر سلامت تھا نہ تیسرا والا مکان اور نہ چوتھے کا آدھا حصّہ۔ سب کے سب ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔ ملبے کے اس ڈھیر پر جو ہمارا مکان تھا، ہماری ایک بطخ چکراتی پھر رہی تھی۔ پیچھے پیچھے اس کا ایک بچّہ بھی تھا، جبکہ پہلے وہ پانچ تھے۔ ہوا میں چنبیلی کی مہک کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔

ابّا کسی سراسیمہ شخص کی طرح پہلے تو کھڑے کھڑے اس ملبے کو تکتے رہے اور پھر امّی کو ٹکرٹکر دیکھنے لگے جن کو اس ناگہانی نے دم بخود کر دیا تھا۔

اس دن کا آخری اور اندوہ ناک منظر ابّا کو روتے ہوئے دیکھنا تھا، ایسا منظر جو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"زندگی بھر کی محنت پل بھر میں اکارت ہو گئی۔" امی آنسوؤں کی

جھڑی میں سنسنائیں۔

"شکر الحمدللہ۔" ابّا آنسو پونچھتے ہوئے بڑبڑائے، "شکر ہے کہ ہم اندر نہیں تھے۔" کچھ دیر کے لیے خاموشی ہم پر مسلّط رہی، پھر وہ بولے: "اب ہم لوگوں کو اندرونِ ملک ترکِ وطن کر جانا ہو گا۔" اور اس طرح میں نے ایک نئی ترکیب "ترکِ وطن" سیکھی۔

"چلو جب تک کوئی اور بندوبست نہ ہو تمھاری پھوپھی کے گھر چلتے ہیں۔" ابّا نے بات جاری رکھی، "بشرطیکہ وہ بھی ڈھے نہ گیا ہو۔"

غم زدہ جلوس پھر سے مرتب ہوا اور ہم سب مریل چال سے چلتے ہوئے روانہ ہو گئے "جیسے کسی میّت کے ساتھ ساتھ"، جیسا کہ میں سیانا ہو جانے پر اپنے احباب کو یہ واقعہ سناتے وقت کہا کرتا تھا۔ اپنے مکان کے ملبے کے پاس سے ہٹتے وقت میں نے دیکھا کہ ابّا نے باہر کو نکلے ہوئے ایک پتھر کو کھینچا اور دوبارہ ملبے کے بڑے سے ڈھیر کی طرف اُچھال دیا۔

"جب جنگ ختم ہو جائے گی۔" میں نے ان کو کہتے سنا، "تو ہم اس کو پھر سے بنائیں گے۔"

پھر جنگ ختم ہو گئی...

کندھے پر ٹھوکا لگا تو میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میری بیوی کہہ رہی تھی: "تم کو کیا ہو گیا ہے؟ سن رہے ہو؟ ہم کب بنانا شروع کریں گے؟"

اُس مکان کا آسیب ابھی میرے سر میں موجود تھا۔

"جن لوگوں نے تباہی کے یہ سب خوفناک ہتھیار ایجاد کیے ہیں۔" میں بولنے لگا "آخر وہ کوئی ایسی چیز بنانے کی کیوں نہیں سوچتے جو مکانات کو ان کی تباہ کاریوں سے بچا سکے؟"

میری بیوی کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ اس نے مجھ کو یوں دیکھا جیسے بڑے دلار سے سوال کر رہی ہو۔ میں مسکرا دیا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح کھجانے لگا جیسے اپنے خیالات کو اڑا رہا ہوں، اور بولا: "فکر کی کوئی بات نہیں، مجھے اس پر یقین ہے کہ اب جنگ کبھی نہیں ہو گی۔"

اس بات نے میری بیوی کے چہرے کی حیرانی کو اور بھی بڑھا دیا۔

Scanned with CamScanner

٣

ابراهيم الكوني
يوسف ادريس
يوسف شاروني
ادورد الخراط

ابراہیم الکونی (Ibrahim al-Kouni)

ابراہیم الکونی ۱۹۴۸ میں لیبیا کے علاقے غدامس میں پیدا ہوئے۔ وہ ماسکو کے گورکی انسٹیٹیوٹ سے فارغ التحصیل ہوئے اور اب وارسا میں لیبیا کے سفارت خانے کے سربراہ ہیں۔ ان کی کہانیوں اور ناولوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

یوسف ادریس (Yusuf Idris)

یوسف ادریس ۱۹۲۷ میں الشرقیہ کے قریب ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۴۵ میں قاہرہ جا کر طب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور وہیں اس دہائی کے آخری برسوں میں ان کی کہانیاں شائع ہونی شروع ہوئیں۔ طب کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے چند سال پریکٹس بھی کی مگر ۱۹۶۵ کے لگ بھگ طب کو خیرباد کہہ کر ہمہ وقتی ادب اور صحافت کو اپنا لیا۔ یوسف ادریس کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ۱۹۵۴ میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد بہت سے مجموعے، ڈرامے اور ناول شائع ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۹۱ میں قاہرہ میں وفات پائی۔ ان کی ایک طویل کہانی [illegible] کا اردو ترجمہ آج کے شمارہ سرما ۱۹۹۲ میں شائع ہوا تھا۔

یوسف شارونی (Yusuf Sharouni)

یوسف الشارونی ۱۹۲۴ میں مصر کے دلتا میں واقع ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے فلسفے کی تعلیم حاصل کی اور پھر کچھ عرصے کے لیے سوڈان میں ملازمت کی۔ آج کل قاہرہ میں فنون، ادب اور علوم معاشرتی کی کونسل میں ایک اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔ ان کا تخلیقی کام زیادہ تر مختصر کہانیوں پر مشتمل ہے اور انہیں اس صنف میں عربی ادب میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ کہانیوں کے علاوہ انہوں نے تنقید بھی لکھی ہے۔

ادورڈ الخراط (Edward el-Kharrat)

ادورڈ الخراط ۱۹۲۶ میں اسکندریہ، مصر میں پیدا ہوئے اور اسکندریہ یونیورسٹی سے قانون کی تعلیم حاصل کی۔ مختلف قسم کی ملازمتیں کرنے کے بعد وہ ۱۹۵۹ میں افرو ایشیائی عوام کی تنظیم اور افرو ایشیائی ادیبوں کی تنظیم سے وابستہ ہو گئے اور اس کے ادبی سیکرٹری جنرل کے عہدے تک پہنچے۔ ۱۹۵۹ ہی میں انہوں نے اپنی کہانیوں کا پہلا مجموعہ "اونچی دیواریں" اپنے خرچ پر شائع کیا۔ اس کتاب کی فروخت تو بہت زیادہ نہ ہوئی لیکن اس نے مصری مختصر افسانے پر گہرا اثر ڈالا۔ ان کی زبان سے متعلق اور پیچیدہ اسلوب جو پروست کی یاد دلاتا ہے ترجمہ کے لیے بے حد مشکل ثابت ہوتا ہے۔ خود انہوں نے بھی انگریزی اور فرانسیسی سے بہت سے ترجمے کیے ہیں۔ ان کے کئی مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔

ابراہیم الکونی

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

صحرا کی دھمک

مصباح سعد لینڈ روور سے کود کر نیچے اترا اور اس میں سے کمبل نکال کر ایک چھدرے صحرائی درخت کے نیچے بچھا دیا۔ اس نے اپنے ساتھی کو لینڈ روور کے سامنے کا حصہ کھول کر تیل کی مقدار جانچنے اور انجن کو ٹھنڈا کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے خاموش اور سورج کے سامنے سپراندار خالی پن پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی جب کہ انجن کی گھرگھراہٹ اُس کے کانوں میں گونجتی رہی۔ "حنّور" وہ کمبل پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا، "تمھارے پاس ایک اسپرین تو نہیں ہو گی؟ تمھاری گاڑی کے شور سے میرے سر میں درد ہو گا۔" اس نے سورج کی شعاعوں میں چمکتی ہوئی ریت پر تھوکا اور تھوک کو ریت کے پے در پے مساموں میں تیزی سے غائب ہوتے ہوئے دیکھنے لگا

"مجھے لگ رہا ہے جیسے میرا بھیجا اُبل رہا ہو،" اس نے کہا۔

حنور بانہوں میں روٹی، سارڈین مچھلیوں کے ڈبّے اور زرد مائع سے بھری بوتل لیے اس کی طرف آیا۔

"تم شہر کے لوگ صحرا کے عادی نہیں ہو۔ ذرا ٹھہرو۔ میرے پاس سردرد اور دوسری بیماریوں کے لیے قدرتی علاج ہے، اسپرین سے زیادہ موثر دوا۔"

"اسی گرمی میں وسکی؟ معاذاللہ؟"

"ہم شام ہونے تک یہاں آرام کریں گے۔" سارڈین کے ڈبے کھولنے میں مشغول جبور نے کہا "پھر رات میں سفر دوبارہ شروع کریں گے۔ یہ ہمارے لیے بھی بہتر ہے اور گاڑی کے لیے بھی۔"

اس نے دونوں ہاتھوں سے روسی موٹی بھری بوتل کھولی اور دو گلاسوں میں وسکی انڈیلی۔

"چلو اب ہم یہ طے کر لیتے ہیں" وہ اسے گلاس تھماتے ہوئے بولا "کہ میں ایک گلاس پیوں تو تم دو پیو گے۔ مت بھولو کہ میں گاڑی چلا رہا ہوں -- پھر میں تمہاری طرح کا پکا شرابی بھی نہیں ہوں۔"

"تم سے کس نے کہا کہ میں پکا شرابی ہوں؟"

"تم شہر کے ہو اور پھر میرا خیال ہے یورپ میں تمہاری زندگی ان چیزوں سے خالی تو نہیں گزری ہو گی۔ رہا میں تو میں تو ابھی بڑھ رہا ہوں اور اگر کبھی میرے باپ کو بھنک پڑ جائے تو وہ مجھ پر بندوق نکال لے -- حضرت موصوف خود اپنے وقت میں خوب پکی چڑھاتے رہے ہیں۔ اب یہ بزرگ کس قدر ظالم تھے کہ کھجور کی لب کے سرے سے مدہوش ہونے کی خاطر سالم درخت کو قتل کر دیتے تھے۔"

"یورپ..." مصباح سعد نے جیسے خود سے بات کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے ایک سینڈوچ لیا اور ایک لمحے میں صاف کیا

"یورپ نے مجھے زیر کر لیا۔ میں تمہاری طرح تھا۔"

"یورپ کی باتوں کو دوسرے گلاس کے بعد کے لیے اٹھا رکھو" جبور نے دوسرا گلاس تھماتے ہوئے اس کی بات کاٹی۔ "اس موضوع سے مجھے بے حد دلچسپی ہے۔ مجھے وظیفے پر فرانس بھیجنے کا وعدہ کیا گیا ہے تاکہ میں زرعی انجینئر کے پیشے میں ترقی کر سکوں۔ زرعی انجینئر... کیا پتہ ہے تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کس قدر مصیبت کا کام ہے؟ اب یہ جوارگ (۱)، کسی زرعی منصوبے میں ذرا تعاون نہیں کرتے۔ وہ اب تک اسی گمان میں ہیں کہ وہ اشراف ہیں، صحرا کے سورما ہیں اور کاشتکاری اور کاشتکاروں کو حقیر سمجھتے ہیں۔"

اس نے دانتوں سے سینڈوچ کاٹا اور اسے چباتے ہوئے سوچتا رہا

"مگر... وہ بس اچھے ہوں گے... اور ان کی... مدد کرنی چاہیے۔"

وہ مصباح سعد کی طرف مڑا جو درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا

افق پر جھلملاتے سراب کو تک رہا تھا۔

"تم فکرمند دکھائی دیتے ہو۔ اب یوروپ کے بارے میں سوچنا چھوڑو۔ میں نے کہا تھا، تیسرے گلاس کے بعد۔ تیسرا گلاس تمھیں وہ سارے راز کھولنے پر مجبور کر دے گا جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔"

"یوروپ میں کچھ بھی راز نہیں ہوتا۔"

"دیکھیں گے۔ دیکھیں گے۔ دوسرے گلاس کے بعد بھی تم فکرمند لگ رہے ہو۔ اوہ، مجھے یاد آیا ۔۔ غات کے گورنر کے بارے میں تمھاری کیا رائے ہے؟ ۔۔ تو کسی صحافی کے لیے دھماکے کی خبر ہو گی۔ وہ بہت منکسرالمزاج آدمی ہے، اس نے تمھیں وہ قصہ نہیں سنایا کہ اس نے کس طرح سنوسیوں کے حملے میں، اپنے تین بچوں کے ساتھ مل کر، پورے فرانسیسی بکتربند دستے کا مقابلہ کیا تھا ۔۔ اپنی تحقیق میں اس واقعے کو شامل کرنا مت بھولنا۔"

"یوروپ جانے سے پہلے،" مصباح نے اپنی خواب آلود آواز میں اس کی بات کاٹی، "میں تمھاری طرح تھا۔"

اس نے جبّور کے ہاتھ سے گلاس لے لیا۔

"یوروپ مت جانا،" اس نے مضبوط لہجے میں کہا، "میں تمھیں اس کا مشورہ ہرگز نہیں دوں گا۔"

جبور نے استفسار کے انداز میں اپنا سر اٹھایا۔ جبور سے ایک سگریٹ لیتے ہوئے وہ بولا:

"اس کی وضاحت کرنا مشکل ہے۔"

"تیسرے گلاس کے بعد بھی؟"

"دسویں کے بعد بھی۔"

کئی منٹ تک خاموشی رہی۔ پیشانی سے بہتے ہوئے پسینے کو قمیص کی آستین سے پونچھتے ہوئے جبّور نے کہا،

"مجھے امید ہے کہ جب تم واپس جاؤ گے تو تمھارے پاس جنوب کی زندگی کے بارے میں اچھاخاصا مسالا ہو گا۔ میرے خیال میں تم اس ملک میں پہلے صحافی ہو جو اپنے پیشے کے معاملے میں سنجیدہ ہے۔"

مصباح سعید اپنے سگریٹ کے دھوئیں کو ہوا میں بکھرتے دیکھتا رہا۔

"ہاں" اس نے مایوس لہجے میں جواب دیا، "مگر مجھے اس میں کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا۔"

Scanned with CamScanner

جنّور آ کر اس کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"شاید۔" اس نے وسیع خلا کو گھورتے ہوئے، رازدارانہ انداز میں کہا، "مگر میں اسے یوں نہیں دیکھتا۔ ان بدقسمت لوگوں کے لیے کچھ نہ کچھ تو ضرور کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی بدحالی پر قانع ہیں، مصیبتوں کے سامنے ہار مان بیٹھے ہیں، جیسے خدا نے ان کی تقدیر میں یہی لکھا ہو۔ ہمارا کام اس قناعت کے احساس کو ختم کرنا ہے، انہیں یقین دلانا ہے کہ وہ بدفطرت لیفٹیننٹ اور اس کا مددگار گورنر پتلوں سے زیادہ کچھ نہیں جنہیں کرسیوں پر بیٹھنے اور حکمرانوں کے نام مشتبہ رپورٹیں لکھ لکھ کر بھیجنے کے لیے رکھ گیا ہے۔ ان کی قناعت کو ختم کرنا مشکل ہے مگر کوشش کرنا ہمارا فرض ہے۔"

اس نے سگریٹ کا کش لیا اور مزید کہا،

"اور یہ کام اخباروں کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔"

"لیفٹیننٹ تو اچھا آدمی ہے۔"

"اچھا آدمی؟"

خاموشی کے ایک وقفے کے بعد وہ پھر بولا، "اچھے آدمی قتل نہیں کرتے۔"

"قتل؟"

"اور کیا؟ اس نے مظاہرے میں چونسٹھ لوگوں کو ہلاک اور زخمی کیا۔ اس نے مظاہرہ کرانے پر مجھے آج تک معاف نہیں کیا۔ وہ مجھ پر بڑی شفقت ظاہر کرتا ہے مگر یہ سب ڈھونگ ہے۔ ڈھونگ اور کمینگی۔ وہ نہیں بھولا کہ اس جرم کی وجہ سے اس کے دو ستارے اتار لیے گئے تھے، اور اس کا خیال ہے کہ میں اب تک لوگوں میں سیاسی کام کر رہا ہوں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ آدمی کا ذاتی مفاد ہر چیز سے زیادہ طاقت ور ہوتا ہے۔"

مصباح کی آنکھوں میں استعجاب ظاہر ہوا لیکن وہ چپ رہا۔ وہ سراب کو خاموشی، ریت اور دھندلے افق سے زورآزمائی کرتے دیکھ رہا تھا۔

جب لینڈ روور لامتناہی تک پھیلے ہوئے خالی پن میں روانہ ہوئی تو سورج ڈوبنے لگا تھا۔

"صحرا... کس قدر سنسان اور ڈراونا ہے" مصباح نے کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

Scanned with CamScanner

اسٹیئرنگ کو پوری قوت سے پکڑے ہوئے جنور نے تبصرہ کیا

"ہاں، سنسان اور ڈراونا تو ہے، مگر زندگی کی طرح ہے، وجود کی طرح، ویرانی اور خاموشی میں دبا ہوا ایک راز۔ یہ آدمی کو ہر چیز کا بہلاوا دیتا ہے، راستے سے بھٹکے ہوئے مسافر کے لیے سب سے زیادہ قیمتی چیز کا۔ یہ اسے پانی کا بہلاوا دیتا ہے اور جب وہ اس کی طرف دوڑتا ہے تو اسے اپنے سامنے صرف سراب ملتا ہے — سراب ہی سراب، سرابوں کا سمندر۔ یہ سراب نظروں کے سامنے ناچتے ہیں اور زبان نکال کر منہ چڑاتے ہیں، اور بےمقصد بھٹکاتے پھرتے ہیں۔ لیکن خبردار، آدمی کو مزاحمت ضرور کرنی چاہیے۔ سراب کو سراب سمجھ کر مایوس نہیں ہو جانا چاہیے، کیوں کہ صحرا کا سراب ایک معمّا ہوتا ہے، جس کے پیچھے سچ مچ کے پانی کو تلاش کرنا لازمی ہے۔ خود کو مایوسی کے حوالے نہیں کر دینا چاہیے کیوں کہ آخر میں، دور، سراب کے پیچھے، نخلستان نہیں تو کنواں ضرور ملے گا۔ اصل بات ہے مزاحمت کرنا — یہ صحرا سے معاہدہ کرنے کا پہلا گُر ہے۔"

وہ مصباح کی طرف مڑا اور اس سے ایک سگریٹ سلگا کر دینے کو کہا۔ خاموشی کے ایک وقفے کے بعد جس میں صرف انجن کی گھرگھراہٹ سنائی دے رہی تھی، وہ بولا،

"صحرا کسی عشوہ طراز عورت کی طرح ہے، ناقابلِ تسخیر، نخرے باز، پہلی بار میں کبھی ہاتھ نہ آنے والا۔ اس کے راز دریافت کرنے، اس پر قابو پانے کی کوشش کرنی پڑتی ہے، پھر کہیں اس پر تصرّف حاصل ہوتا ہے۔ تمہیں اس میں کوئی مقصد دکھائی نہیں دیتا۔ مگر مجھے ہر چیز میں مقصد نظر آتا ہے۔ صحرا نے مجھے یہی سکھایا ہے۔ جہاں تک یوروپ کا تعلق ہے، اس نے تمہیں اس لیے زیر کر لیا کہ تم نے اس سے ہار مان لی۔"

مصباح نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ باہر کے خلا میں اندھیرے کو اترتے دیکھتا رہا، موٹر کی گھرگھراہٹ سنتا رہا جو اس کے کانوں کو چھیدے ڈال رہی تھی اور جس سے اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔

ریت کے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پاس پہنچ کر جنور نے گاڑی روک لی۔ وہ باہر نکل کر پہاڑی پر چڑھا اور ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔

"آدھی رات کا وقت ہے،" وہ واپس نیچے اترتے ہوئے بولا، "اور آبادی کی روشنیاں دور دور تک دکھائی نہیں دیتیں۔ لگتا ہے ہم راستا بھول گئے ہیں۔"

گاڑی سے کود کر باہر نکلتے ہوئے مصباح نے چڑ کر کہا،

Scanned with CamScanner

"ہمیں شروع ہی سے بڑی سڑک پر رہنا چاہیے تھا۔"

"نہیں یہ کہو کہ ہمیں اتنی نہیں پینی چاہیے تھی -- یہ زیادہ درست ہو گا۔" جبور نے ہنستے ہوئے خود کو نرم ریت پر گرا دیا اور جیب میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا۔

"میں شارٹ کٹ لینا چاہتا تھا۔" سگریٹ جلا کر اس نے آہستہ سے کہا۔ "میں نے اپنے تجربے پر بھروسہ کیا مگر لگتا ہے کہ صحرا شرابیوں کو معاف نہیں کرتا۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہم چوتھی غلطی سے محفوظ رہیں، تو ہمیں سورج نکلنے تک یہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اتنا پٹرول نہیں ہے کہ ہم صحرا میں یوں ہی بھٹکتے پھریں۔ ہمارے پاس پٹرول کا کافی ذخیرہ بھی نہیں ہے یہ ہماری سستی اور بدترین غلطی ہے۔ آ جاؤ، پیارے دوست، آج رات تو تمہیں مجھ سے یوروپ کی باتیں کرنی ہی پڑیں گی، وقت کاٹنے کے لیے ہی سہی۔"

وہ خوش دلی سے ہنسنے لگا مگر مصباح کے تیور دیکھ کر رک گیا مصباح ٹھنڈی ریت پر ڈھیر ہو گیا تھا اور تاریک خاموشی میں ڈوبے ریت کے ٹیلوں کو دیکھ رہا تھا۔

"تھوڑی دیر میں چاند اپنا چہرہ دکھائے گا۔" جبور اس کی بےچینی کے سبب کو محسوس کر کے، گویا اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تم دیکھنا صحرا چاندنی رات میں کیسا طلسمی دکھائی دیتا ہے۔ جب وہ کسی یوروپی عورت کی طرح خود کو عریاں کرے گا تب تمہیں اس طلسم کا لطف آئے گا۔ وہ تم پر اپنے بہت سے راز آشکار کرے گا، اپنے بےشمار راز جیسے ریت کے ذرے۔"

مصباح سعید توجہ سے کان لگائے سنتا رہا۔ اسے لگا کہ کہیں قریب سے بہت قریب سے پہاڑی کے پیچھے سے یا چوٹی سے اٹھتی ہوئی ڈھول کی تھاپ اور موسیقی کی گونج سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ وہ پھر غور سے سننے لگا، ڈھول کی تھاپ اور تیز، اور موسیقی کی گونج اور شدید ہو گئی۔ یہ کوئی افریقی دھن تھی -- شدید اور گونج دار، شوریدہ سر اور غضبناک۔

مصباح سعید اتنا مضطرب ہو گیا کہ اسے ڈر ہوا کہ کہیں وہ اپنے ساتھی سے ان آوازوں کا تذکرہ نہ کر بیٹھے۔

اس نے اس واقعے سے نجات پانے کے لیے خود کو کسی طرح مصروف

کرنے کا ارادہ کیا اور ایک قدیم لوک گیت گانے لگا

چاند کا زرد چہرہ ریتلی پہاڑی کے پیچھے سے نمودار ہونا شروع ہوا۔ مصباح نے، جو ابھی تک اضطراب کی گرفت میں تھا دریافت کیا:

"جبور، کیا تمہارے خیال میں آس پاس خانہ بدوش قبائلی رہتے ہیں؟ مثلاً طوارگ؟"

"طوارگ کہیے اسمان تلے نہیں رہتے،" جبور نے سگریٹ سلگ کر کاہلی سے ریت پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔ اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی اور دور، خلا میں دیکھا۔ "ان ویرانوں میں صرف بھیڑیوں، خاموشی اور مختلف قسم کی چھپکلیوں کا بسیرا ہوتا ہے۔ وہ بھی صرف رات کے وقت -- دن میں تو یہاں فقط دھوپ کی تپش اور سراب ہوتے ہیں۔"

"عجیب بات ہے، مجھے کچھ دیر پہلے یوں محسوس ہوا۔۔۔" وہ اپنا زار ظاہر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا، "کچھ دیر پہلے مجھے ڈھول کی دھمک اور کسی دبو سے ساز پر بجائی جانے والی موسیقی سنائی دی تھی۔"

"دیکھا!" جبور مسکرا کر بولا، "یہ پہلا زار ہے۔"

"تم مذاق کر رہے ہو۔"

"نہیں، میں مذاق نہیں کر رہا،" جبور فوراً سنجیدہ ہو کر بولا "یہ صحرا کی دھمک ہے۔"

"صحرا کی دھمک؟" مصباح نے بچوں کے سے لہجے میں پوچھا۔ "تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔"

"یہ بات نہیں۔ صحرا ایک زندہ وجود ہے انسان کی طرح۔ اس میں جان اور روح ہوتی ہے اور اس کی جلد میں مسام ہوتے ہیں۔ اسے دکھ بھی پہنچتا ہے۔ رات میں یہ ناچتا ہے، گاتا ہے، ڈھول بجاتا ہے، ساز چھیڑتا ہے۔ وہ شدید خوشی سے ہوئے دن کی ادبیت ختم ہونے پر خوشی مناتا ہے تم صحرا کو نہیں جانتے، مصباح۔"

مصباح خاموش رہا اور جبور نے زرد چاند کی طرف رخ پھیرا

"تم افریقی موسیقی کی کامیابی کا راز نہیں جانتے" وہ کہتا رہا "وہ راز یہی ہے کہ یہ موسیقی صحرا کے پیٹ سے نکلتی ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کو تکنے رہنے سے وہ پاگل ہو جائیں گے اس لیے وہ اس کے رقص اور جنس میں

شامل ہو گئے اور اس طرح اس کے خوف پر فتح پا کر انھوں نے اسے زیر کر لیا۔ اگر وہ تماشا دیکھنے والوں کا سا انداز اختیار کیے رہتے تو دہشت اور دیوانگی میں مبتلا ہو جاتے۔ وہ اس سے اسی طرح سرد آزما ہوتے ہیں جیسے زندگی سے۔ جب میں نے پہلی بار یہ ڈھمک سنی تھی تو دہشت میں آ گیا تھا لیکن بعد میں مجھے اس کی عادت ہو گئی۔"

"میں نے تو اس کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔"

"اور بہت کچھ بھی نہیں۔ تم شہر والوں نے خود کو شہروں میں بند کر لیا ہے اور زندگی اور دوسری خبروں کی شکایت کرتے رہتے ہو۔ تم بھلا صحرا کو کیسے سمجھ سکتے ہو؟ میں نے تمھیں بتایا ہے، صحرا عورت کی طرح ہے جسے شروع ہی میں جان لینا دشوار ہے۔ اگر تم اس کے رازوں سے واقف ہونا چاہتے ہو تو تمھیں طویل عرصے کے لیے اس کی قربت اختیار کرنی پڑے گی۔"

اس نے اپنے جوتے اتار دیے اور ہاتھ اور پیر ٹھنڈی ریت میں دھنسا دیے۔

"صحرا کتنا غم زدہ ہے،" اس نے رکتی ہوئی آواز میں کہا۔ "سارے دن کے ہاتھوں اذیت اٹھاتی پڑتی ہے، دھوپ اس کی ہڈیاں پگھلا دیتی ہے۔ وہ ریت کے باریک ذروں پر طلسمی دُھنیں چھیڑ کر اپنے ازلی غم کی شکایت کرتا ہے۔ وہ موسیقی چھیڑتا رہتا ہے، ڈھول بجاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ صبح آ جاتی ہے اور وہ ایک بار پھر اپنا بدن اپنے جلاد سورج کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور اس طرح ازلی و ابدی اذیت کا سفر جاری رہتا ہے۔"

جنور نے زمین پر سر جھکا رکھا تھا، اس کے ہاتھ اور پیر ریت میں دبے ہوئے تھے۔ مصباح سعد کو محسوس ہوا جیسے وہ ابھی رو دے گا۔ وہ خاموشی سے اسے تکتا رہا، پھر اس کے کانوں میں ڈھول کی آواز ہلکورے لیتی ہوئی داخل ہوئی — غمناک اور شوریدہ سر۔

بڑی سڑک تک پہنچنے سے پہلے گاڑی کا پٹرول ختم ہو گیا۔ جنور نے ڈکی کی کنجی لے کر لینڈ روور پر سے چھلانگ لگائی۔

"ہم لعوت کی پولیس چوکی پر جا چکے ہیں، اس لیے وہاں سے مدد ضرور آئے گی۔ ان کے تلاش شروع کرنے سے پہلے ہمیں سڑک تک پہنچ جانا چاہیے۔"

"ہم نے سڑک سے اتر کر ہی غلطی کی۔"

"اصل غلطی تو یہ تھی کہ ہم نے بہت پی لی۔ مجھے ابھی سے پیاس لگنے لگی ہے۔ میں نے ایک ایسا گناہ کیا ہے جسے صحرا کبھی معاف نہیں کرے گا۔"

اس نے پانی اٹھا لیا اور دونوں سڑک کی سمت چلنے لگے۔

دوپہر ہو گئی۔ سورج اپنے بےلگام شعلوں کے ساتھ صحرا کے بدن کے بالکل قریب آ گیا۔ پانی کا آخری قطرہ تک ختم ہو چکا تھا مگر وہ سڑک تک نہیں پہنچے تھے۔

مصباح اپنی سانس درست کرنے کے لیے جھلسی ہوئی ریت پر بیٹھ گیا جبکہ حنور انگلیوں سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے اپنے سامنے حدِنظر تک پھیلی ہوئی وسعت کو دیکھ رہا تھا۔

"میں کہیں نہیں جا رہا۔" مصباح اپنے منہ کے اندر کی دیواروں اور سوکھے ہوئے ہونٹوں کو زبان پھیر کر تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "مجھ میں اب دم نہیں ہے۔"

حنور نے اسے سہارا دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، لیکن اس نے سختی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

اس نے حنور کے بولنے کی آواز سنی، پھر اسے اپنے پاس بیٹھتے ہوئے محسوس کیا، پھر اسے لگاتار باتیں کرتے اور ہاتھوں سے مسلسل اشارے کرتے ہوئے دیکھا، مگر اسے آواز نہیں آ رہی تھی، وہ کچھ نہیں سن رہا تھا کچھ نہیں دیکھ رہا تھا۔ جب حنور نے اسے اپنے کندھوں پر اٹھایا تو سب کچھ تاریکی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ لڑکھڑاتا، گرتا، پھر اسے پاؤں سے پکڑ کر گھسیٹنے لگا، اور نرم صحرا اپنی عصاک، بوجھل دُھن پھر چھیڑ دیتا۔

نارنجی چمک میں سورج کی ٹکیا افق سے ہم آغوش ہو گئی۔ جلتی ہوئی شعاعیں دن بھر بستی کو کوٹ دہکتی ہوئی سلاخوں سے پیٹتی رہی تھیں۔ تمازت کے ختم ہوتے ہی چھپکلیاں اور کیڑےمکوڑے اپنی اپنی پناہ گاہوں سے نکل آئے اور جھاڑیوں، ویران کھیتوں اور کھجور کے درختوں میں پھرنے لگے۔ لوگ بھی، جو دن بھر اپنی جھونپڑیوں میں گھسے رہے تھے، باہر نکل کر اپنے کاشت کیے ہوئے کھیتوں کی طرف چل دیے اور آبپاشی کی سوکھی نالیوں کو بھرنے کے لیے پمپ چلانے لگے۔

گیسٹ ہاؤس کے سامنے کے احاطے میں بڑے بڑے سفید صافوں والے بستی کے بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور تجسس بھری آنکھوں سے کھڑکیوں میں سے جھانک رہے تھے۔

لینڈ روور، اپنے پیچھے گرد کا ایک طویل سلسلہ چھوڑتی ہوئی آ پہنچی۔ بستی کے لوگ جھک کر ملٹری کی عمارت کی پشت پر لگے ہوئے کھجور کے درختوں میں جا چھپے۔ دراز قد لیفٹیننٹ نے باہر قدم رکھا۔ وہ یونیفارم میں ملبوس تھا اور اس کے کندھوں پر چاندی کے دو ستارے چمک رہے تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی۔ وہ گیسٹ ہاؤس کے احاطے میں پہنچ کر رکا اور اندر داخل ہونے سے پہلے کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

”اب تمہارا کیا حال ہے؟“ اس نے لکڑی کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے، کسی تمہید کے بغیر سوال کیا۔

مصباح سعید بستر میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پیٹھ دیوار سے لگا لی۔

”خدا کا شکر ہے“ وہ بولا۔ ”میری طاقت رفتہ رفتہ واپس آ رہی ہے۔ تازہ ترین خبر کیا ہے؟“

لیفٹیننٹ نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ مصباح سعید کو پیش کیا جس نے لیفٹیننٹ کی سگریٹ سلگانے کے لیے دیاسلائی جلاتے ہوئے اپنا سوال دوہرایا۔

”کیا خبر ہے؟“

”کچھ نہیں۔ آخری رپورٹ مجھے کچھ دیر پہلے ملی تھی ... ابھی تک کچھ پتہ نہیں چلا۔ گاڑیاں مسلسل صحرا کی خاک چھان رہی ہیں۔“

جھینگروں کی آوازیں اور بستی والوں کی دبی دبی سرگوشیاں خاموشی کو چیر رہی تھیں جو دوبارہ گیسٹ ہاؤس کے گرد جمع ہو گئے تھے۔

”تمہیں بھی ان کے ساتھ جانا چاہیے۔“

Scanned with CamScanner

"میرا خیال ہے اب وقت گزر چکا ہے" لیفٹیننٹ اس تجویز کے جواب میں بولا۔ باہر خاموشی میں جھینگروں کا شور اور پمپوں کی گھڑگھڑاہٹ اور بلند ہو گئی تھی۔ لیفٹیننٹ نے اپنی بات دوہرائی:

"میرا خیال ہے اب وقت گزر چکا ہے۔"

پمپوں کی گھڑگھڑاہٹ تھم گئی تھی، بستی والے اپنی جھونپڑیوں میں واپس چلے گئے تھے، اور رات کیڑے مکوڑوں اور چھپکلیوں کی آماج گاہ بن گئی تھی؛ صرف جھینگروں کی مسلسل ماتمی آوازیں خاموشی کو توڑ رہی تھیں۔ ایرانی قالین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے، سوتی کپڑوں میں ملبوس لیفٹیننٹ راکھ میں چھپے انگاروں کی آنچ پر سبز چائے تیار کر رہا تھا۔

"انھوں نے اسے کنویں میں ڈوبا ہوا پایا،" اس نے کہا۔ "وہ بالکل ننگا تھا۔"

اس نے کھجور کی شاخ کا پنکھا جھل کر انگاروں پر سے راکھ ہٹائی اور دھیمی آواز میں کہتا رہا:

"تمھیں پتا ہے، شدید پیاس کے عالم میں آدمی یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ اس کے کپڑے اس کے جسم پر بہت بھاری ہو گئے ہیں، اور وہ خود کو ہر بوجھ سے آزاد کرنا چاہتا ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ ننگ پھرنے کی شرم سے آزاد ہو چکا ہوتا ہے۔"

"پیاس،" اس نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اپنی بات پھر شروع کی، "پیاس اس کے ذہن سے یہ بات محو کر دیتی ہے کہ کپڑوں کے بغیر کنویں پر پہنچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ انھیں پھاڑ کر وہ ان کی رسی بنا سکتا تھا اور کنویں کے پانی میں بھگو کر اسے چُوس سکتا تھا۔ مگر کپڑوں سے اس نے خود کو آزاد کر لیا ہے اور اب اسے ایک سفاک انتخاب کا سامنا ہے: یا تو وہ کنویں کی منڈیر پر سے جھانک کر پانی کو دیکھتے دیکھتے پیاسا مر جائے، یا پھر پانی میں، یعنی کنویں میں، ڈوب کر مر جائے۔"

وہ چائے میں چمچ ہلانے لگا۔ پھر اپنی آواز کی لاتعلق لہجے کو تبدیل کرنے کی کوشش کیے بغیر اس نے اپنی بات جاری رکھی:

"تم تصور کر سکتے ہو کہ آدمی کے لیے پچاس میل کا راستا طے کرنے کے

بعد آخر میں کنویں کی تہہ میں ڈوب کر مر جانا کیا معنی رکھتا ہے۔ اس نے بہت دیر تک مزاحمت کی، اور پوری طرح ناامید اور پاگل ہونے پر ہی کنویں میں چھلانگ لگائی۔"

اس نے مصباح کو چائے کا فنجان تھمایا جو اس نے فرش پر اپنے سامنے رکھ لیا۔ وہ خاموش رہا، اس کی پشت ٹھنڈی دیوار سے لگی ہوئی تھی اور وہ باہر سے آتی ہوئی جھینگروں کی مدھم آوازیں سن رہا تھا۔ اپنے انگوٹھے کو ایرانی غالیچے پر بنے ہوئے نقش پر پھیرتے ہوئے وہ آہستہ سے بولا،

"لیفٹیننٹ، میں نے خشک سالی اور قحط کے دنوں میں الحمادہ الحمرا میں پیش آنے والا ایک قصہ سنا تھا۔ ایک بدو کو کھلے آسمان تلے ایک راہزن ملا جو اسے اس کے اونٹ سے محروم کرنا چاہتا تھا۔ بدو نے اس سے التجا کی کہ یہ اس کا واحد اونٹ ہے اور وعدہ کیا کہ وہ اسے اپنی جان پہچان کے ایک رئیس کے پاس لے جائے گا جسے اپنے اونٹوں اور بھیڑوں کے گلّے کے لیے کسی گلہ بان کی ضرورت ہے۔ رئیس کے گاؤں کو جانے والے راستے پر راہزن کا پاؤں جنگ عظیم کے زمانے کی لگائی ہوئی ایک بارودی سرنگ پر پڑ گیا۔ جب اسے اپنے پاؤں کے نیچے سرنگ محسوس ہوئی تو اس میں انسانی رحم دلی بیدار ہو گئی اور اس نے بدو سے بھاگ کر جان بچانے کو کہا۔ لیکن راہزن کی اس انسانیت پر متعجب ہو کر بدو نے اس کے پاؤں کے نیچے ایک گہرا گڑھا کھودنے پر اصرار کیا۔ گڑھا کھود کر اس نے راہزن سے کہا کہ وہ اس کے دور چلے جانے کے بعد پلٹ کر اس گڑھے میں گر جائے۔ بدو بھاگ کر بہت دور چلا گیا کہ راہزن کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب راہزن نے احتیاط سے اپنا پاؤں سرنگ پر سے ہٹایا اور پلٹ کر پیچھے گڑھے میں جا گرا۔ مگر بدو سرنگ کے ایک اڑتے ہوئے بارودی ٹکڑے کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا جبکہ راہزن کو خراش تک نہ آئی۔ تم میری بات سمجھے، لیفٹیننٹ؟

"سمجھ گیا۔"

"بےچارہ معصوم شخص مارا جاتا ہے اور راہزن کو خراش تک نہیں آتی۔ سمجھے تم، لیفٹیننٹ؟"

"سمجھ گیا۔ سمجھ گیا۔ زندگی... زندگی صحرا کی طرح سفاک ہے۔ صحرا میں زندگی ایک جرم ہے۔ میں نے یہ بات کوہ اکاکس کی دیواروں پر تفیناغ (۲) رسم الخط میں لکھی ہوئی دیکھی تھی اور طوارق کے ایک عالم شیخ نے ترجمہ کر کے مجھے سنائی تھی۔"

مصباح سعید دیوار سے پیٹھ لگائے بیٹھا رہا۔ کچھ لمحوں بعد خاموشی کی آنتوں میں سے اٹھتی ہوئی ڈھول کی دھمک سنائی دینے لگی؛ مبہم، شوریدہ سر اور گونج دار، پھر بھی بےحد غم ناک دُھن۔

دھمک مسلسل سنائی دیتی رہی؛ پھر اس میں گانے کی آوازیں بھی شامل ہو گئیں؛ ایک عجیب گیت جو ماتم کی آوازوں سے مشابہ تھا۔ سے گانے اور ڈھول کی دھمک میں ملی جلی چیخوں اور کراہوں کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ اس نے سر جھٹک کر ان آوازوں سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی۔ اپنی اس کیفیت کے باوجود اس نے پوچھا:

"کیا تمھیں ڈھول بجنے کی آواز سنائی نہیں دیتی؟"

"کیوں نہیں۔ یہ طوارگ ناچ گا رہے ہیں۔"

"طوارِگ؟"

"طوارگ ہر جمعے کو، آدھی رات کے وقت جمع ہو کر صبح تک گانے اور ڈھول کی آواز پر رقص کرتے ہیں۔ یہ ان کا طریقہ ہے۔"

پھر وہ اٹھا اور جوتے پہننے لگا۔

"تمھیں آرام کرنا چاہیے۔ کل بہت لمبا سفر کرنا ہے۔"

وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں مصباح نے ڈھول کی آوازوں میں الجھی ہوئی لینڈ روور کے انجن کی گھرگھراہٹ سنی۔ وہ کچھ دیر سنتا رہا؛ پھر کپڑے بدل کر باہر نکل گیا۔

وہ تاریکی میں ڈوبے کھجور کے درختوں میں سے راستہ بناتا ہوا بڑھتا گیا۔ وہ قبرستان میں سے ہو کر گزرا۔ ایک ریتیلی پہاڑی کے پیچھے اس نے ڈھولوں کے گرد عورتوں کو سیاہ لباس پہنے، ایک حلقے کی شکل میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ حلقے کے درمیان نقاب پہنے ہوئے مرد بڑی بڑی سفید پگڑیاں باندھے رقص کر رہے تھے؛ وہ ایک دوسرے کو پکارتے، ان کے رقص کرتے ہوئے جسم تشنج کی سی کیفیت میں تھے اور وہ مٹھیوں سے اپنے سینوں پر ضربیں لگا رہے تھے۔

وہ پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر ان کا دیوانہ وار رقص دیکھنے لگا۔ ان

کے ڈھولوں کی گونج دار دھمک، ان کی کربناک چیخیں اور ان کے گیت کی آواز اس کے کانوں میں آ رہی تھی، جو یوں لگتی تھی جیسے وہ کسی مرنے والے کا ماتم کر رہے ہوں۔ یہ شور تاریکی، صحرا اور رات کی خاموشی کو چیر رہا تھا۔

کھڑکی کے شیشوں اور دروازوں سے ٹکراتی ہوئی تیز ہواؤں نے اسے صبح سویرے جگا دیا۔ وہ استقبالیہ کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا؛ ریت اس کے بالوں کی جڑوں میں، گردن کے گرد اور لباس کے اندر گھسی جا رہی تھی۔

لیفٹیننٹ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے گرمیوں کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس نے علیک سلیک کیے بغیر اس سے پوچھا:

"تم تیار ہو؟ ہمیں طوفان کے اور شدید ہونے سے پہلے روانہ ہونا ہے تاکہ دوپہر کا جہاز نہ نکل جائے۔ تم میرے ساتھ چلو گے۔"

لیفٹیننٹ اسٹیئرنگ کے پیچھے بیٹھ گیا اور لینڈ روور کو بے حد تیز رفتار سے دوڑانے لگا جو ایسے دن کے لحاظ سے خطرناک تھی جب اڑتی ہوئی گرد کی وجہ سے دس میٹر کے آگے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ان کے ایک دوسرے سے ایک لفظ کہے بغیر پندرہ منٹ گزر گئے۔ اس کے بعد لیفٹیننٹ نے کہا:

"مہربانی کر کے ایک سگریٹ تو دینا۔"

مصباح نے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ لیفٹیننٹ کے لیے اور دوسرا اپنے لیے سلگایا۔ کش لگاتے ہوئے لیفٹیننٹ نے کہا:

"آدمی کو ہر چیز کا پورا لطف اٹھانا چاہیے۔" پھر وہ کھانسا اور بولا "سگریٹ پینے کا بھی۔"

"ہاں۔ ہر چیز کا لطف اٹھانا چاہیے،" مصباح نے طنز کے سے انداز میں تبصرہ کیا۔ پھر وہ لیفٹیننٹ کی نقل اتارتے ہوئے کھانسا اور اسی کا لہجہ بنا کر بولا: "جرم کرنے کو بھی۔"

لیفٹیننٹ نے سر گھما کر تیزی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا نچلا ہونٹ کانپنے لگا۔

"کیا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ "کیا مطلب ہے تمہارا؟"

Scanned with CamScanner

"کچھ نہیں۔"

ان کے درمیان خاموشی چھا گئی اور لیفٹننٹ نے ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

مصباح کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا جب وہ چونکا دینے والے سکون کے ساتھ بولا:

"تم نے اسے کیوں قتل کیا؟"

"میں تمھاری بات نہیں سمجھا۔"

"تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ کل لوگوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

لمحہ بھر کی خاموشی کے بعد لیفٹننٹ نے جواب دیا:

"لوگوں نے! لوگوں نے شاید تمھیں میری اور اس کی دشمنی کا قصہ بھی سنایا ہو گا؟"

"نہیں۔ انھوں نے مجھے دوسری چیزوں کے بارے میں بتایا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

خاموشی ان کے درمیان پہاڑ کی طرح کھڑی تھی۔ لیکن مصباح سعد نے سرعت سے ہاتھ بڑھا کر لیفٹننٹ کا بازو دبوچ لیا اور چیخ کر کہا:

"نہ سمجھے ہو۔۔۔ تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔"

لیفٹننٹ کو بریک لگا کر گاڑی کو روکنا پڑا۔ اپنے تاثر سے کوئی غصہ یا برہمی ظاہر کیے بغیر اس نے مصباح کا ہاتھ اپنے بازو سے الگ کیا۔

ریت کا طوفان اس قدر شدید ہو گیا تھا کہ آنکھوں کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا۔ لیفٹننٹ نے طوفان کے تھم جانے تک انتظار کرنے کا فیصلہ کیا اور گاڑی کو سڑک کے کنارے روک لیا۔ پھر اس نے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور مصباح کو ایک سگریٹ پیش کیا، مگر اس نے چونک کر انکار کر دیا۔ لیفٹننٹ نے اپنا سگریٹ سلگایا اور دھوئیں کے بادل میں سے بڑے سکون سے بولا:

"بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنھیں تم نہیں جانتے ۔۔ بہت ساری چیزیں۔"

"لیکن بہت سی چیزیں میں جانتا ہوں۔ آج کے بعد میرا اتنا جاننا کافی ہے کہ قانون سے تعلق رکھنے والا شخص دن دہاڑے سب کے سامنے جرم کا ارتکاب کر کے بھی بچ سکتا ہے۔"

Scanned with CamScanner

"کیا تم اسے جرم سمجھتے ہو؟"

"ہاں۔ اس کی جان بچا لینا تمہارے لیے ممکن تھا۔"

"کسی کی جان بچانا قانون سے تعلق رکھنے والے آدمی کی ذمے داری نہیں ہے۔"

"ذمے داری ہے۔ بلکہ یہ تمہارا فرض ہے۔"

"ہاں اب ہم اصل بات کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ سنو۔ غور سے سنو۔ صحرا کی زندگی کا انتخاب کرنے والے کو کسی کے بھروسے پر نہیں رہنا چاہیے۔ وہ کسی کے حکم کا پابند نہیں ہوتا۔ پوری طرح آزاد ہوتا ہے، چاہے اسے معلوم نہ ہو کہ غزالوں اور شتربانوں کا تعاقب کرنے کے سوا وہ اس آزادی کا کیا استعمال کرے۔ جب وہ پیاسا ہو یا مشکل میں ہو تو اسے اپنے آپ پر انحصار کرنا چاہیے۔ اپنی مکمل آزادی کی، کسی کے حکم کا پابند نہ ہونے کی قیمت ادا کرنی چاہیے۔"

مصباح سمند پر لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ لیفٹیننٹ کے قریب ہو کر بولا:

"اگر حضور پر کسی کے حکم سے آزاد ہوتا تو تم پر انحصار نہ کرتا۔"

دونوں نے تیزی سے ایک دوسرے کو دیکھا، اور پھر لیفٹیننٹ نے کہا:

"اگر وہ حکم کا پابند تھا تو اس نے صرف اُن احمق معاملوں کو اپنی طرف کرنے کے لیے میرے خلاف آواز کیوں اٹھائی؟ طوارگ نے اسے سخت کوشی کی زندگی اور صحرا کا انتخاب کرنا سکھایا تھا۔ اس لیے اسے معلوم تھا کہ اسے بچانے کے لیے کوئی نہیں آئے گا، اور اس کی موت اس کی آزادی کے دفاع کی قیمت تھی۔ اقتدار ان کی حفاظت نہیں کرتا جو اُس کی مخالفت میں آواز بلند کرتے ہیں۔ جب اقتدار تمہیں روٹی اور تحفظ دیتا ہے، تمہاری دیکھ بھال کرتا ہے تو اگر تم اس سے دشمنی کرنے کی کوشش کرو تو وہ تمہارا سر بھی کچل ڈالے گا۔ وہ تمہیں خاموش رہنے کا معاوضہ ادا کرتا ہے، تمہاری مسلسل خاموشی کی قیمت چکاتا ہے، لیکن اگر تم نے اس سے آزادی حاصل کر لی تو پھر تمہارے پاس صحرا پر انحصار کرنے کے سوا کوئی راستا نہیں۔"

"تمہاری توضیح وحشتناک ہے۔ اس جرم سے بھی زیادہ گھناؤنی۔" مصباح نے دھمکانے والے لہجے میں کہا۔ "مگر ٹھہرو... مجھے دارالحکومت پہنچنے دو۔ میں اخباروں میں تمہارا پردہ چاک کروں گا۔ میں تمہارے جرم کی تفصیل لکھوں گا اور اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک تم پر

Scanned with CamScanner

مقدمہ نہ چلایا جائے۔"

"تمھیں اس سے کچھ حاصل نہیں ہو گا۔" لیفٹننٹ مسکراتے ہوئے بولا۔ "مجھے سزا دلوانے کے لیے تمھارے پاس ذرہ بھر بھی شہادت نہیں ہے۔ جرم تو اصل میں صحرا نے کیا ہے۔ وہ آزادی کی خواہش کے ہاتھوں قتل ہوا۔ آزادی مجرم ہے، اس پر مقدمہ چلنا چاہیے۔ میں نے تو صرف اتنا کیا کہ دیر سے پہنچا، بس ذرا سی دیر سے۔ چند گھنٹے یا شاید آدھا دن، اور یہ میں نے جان بوجھ کر کیا۔ باقی کام میری طرف سے صحرا نے کر لیا۔ مجھے یہ کرنا ہی تھا .. اُس اقتدار کی جانب سے تھوڑی سی سزا جس کے خلاف بغاوت کی گئی تھی، جس کے ہاتھ سے روٹی قبول کرنے سے انکار کیا گیا تھا۔ جہاں تک میرے اس اعتراف کا تعلق ہے، اس کا میرے اور تمھارے سوا کوئی گواہ نہیں، اور اسے، جس کو تم میرا جرم کہہ رہے ہو، ثابت کرنے کے لیے تمھیں کسی تیسرے گواہ کی ضرورت پڑے گی۔"

"مقامی لوگ بھی تو ہیں، وہ میرے حق میں گواہی دیں گے۔ انھوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ تم اور گورنر اور صوبائی افسر اُس سے کتنی نفرت کرتے تھے۔ وہ سب اُس سے ہمدردی رکھتے ہیں اور تمھارے خلاف گواہی دیں گے۔ تمھیں اُس سے نفرت بھی کیوں کہ وہ تمھارے سچ سے واقف تھا، اور میں سب کو بتاؤں گا..."

"اب بس بھی کرو۔" لیفٹننٹ نے سرد لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ "ہمارے زمانے میں سچ جاننا ہی سزا پانے کے لیے کافی جواز ہے۔ سو -- میرا اپنا بھائی بھی مخالفوں میں شامل تھا۔"

پھر وہ کچھ دیر خاموشی سے ریت کے جھکّڑوں کو ونڈسکرین پر سے گزرتے ہوئے دیکھتا رہا۔

"وہ آزادی کے شروع کے دنوں میں صدّی پی سے مخالفت پر اڑا رہا، اور بہت جلد حکّام نے محسوس کر لیا کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔ پھر وہ اچانک غائب ہو گیا۔"

"غائب؟" حیرت کی ایک چیخ مصباح سعید کے ہونٹوں سے نکلی۔

"ہاں، اُس وقت سے آج تک غائب ہے۔"

"مگر کہاں غائب ہو گیا؟"

لیفٹننٹ نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی:

"اُس دن مجھ پر سچ کا انکشاف ہوا۔ مجھے دو باتوں میں سے ایک کا

انتخاب کرنا تھا: سچ کا ساتھ دوں یا اُسے ہمیشہ کے لیے فراموش کر دوں۔"

"یعنی اپنے ضمیر سے غدّاری؟"

"ہاں، میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ میں نے روشی کے حق میں فیصلہ کیا۔"

"تم نے سچ کے بدلے میں روشی لے لی۔" مصباح سعید نے حقارت آمیز لہجے میں تبصرہ کیا۔

"ہاں۔ کیوں نہیں؟"

"تم نے اپنے ضمیر سے غدّاری کی۔"

"کیوں نہیں؟"

خاموشی ان کے درمیان دیوار کی طرح اٹھ آئی۔ کچھ دیر بعد لیفٹسٹ نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی، پھر مصباح سعید کی طرف مڑا اور، پہلی بار درشتی سے خالی لہجے میں بولا:

"مجھے اعتماد ہے کہ تم میری بات سمجھ گئے ہو گے۔"

اس نے چابی گھمائی اور ایکسیلیٹر پر پاؤں رکھ دیا۔

صبح کے ہوائی اڈے کے کیفےٹیریا میں دونوں ایک میز پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ مصباح اپنا سامان جمع کرا چکا تھا۔ ایک طویل خاموشی کے بعد اس نے کہا:

"اس مہربانی کے لیے شکریہ۔"

لیفٹسٹ خاموش رہا۔ اس کی نگاہیں مسافروں کے درمیان بھٹکتی رہیں۔

لاؤڈسپیکر نے مسافروں کو جہاز کی طرف روانہ ہونے کی ہدایت کی تو مصباح اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے لیفٹسٹ کو اس سے پہلے کھڑے ہو کر اس کی طرف ہاتھ بڑھائے ہوئے دیکھا، جیسے بے ہاتھ نہ ہو بلکہ ریوالور ہو۔ مصباح نے اس سے ہاتھ ملایا اور انھوں نے ایک دوسرے پر ایک سرد نگاہ ڈالی۔

اس سے پہلے کہ مصباح دوسرے مسافروں کے ہجوم میں اوجھل ہو جائے، لیفٹسٹ لپک کر اس کے پاس پہنچا اور ایک سرد سرگوشی میں بولا:

"معاملوں کے بھروسے پر مت رہنا۔" اور یہ کہہ کر اس نے ایک زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ اسے الوداع کہا۔

* * * *

(۱) طوارگ : شمالی افریقہ کے صحراؤں میں پائے جانے والے خانہ بدوش قبائل جو اپنی گزراوقات کے لیے کلّہ بانی پر انحصار کرتے ہیں اور، جدید سیاسی سرحدوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، لیبیا، مراکش، الجزائر اور براعظم کے دوسرے ملکوں کے صحراؤں میں ایک نخلستان سے دوسرے نخلستان کی جانب مسلسل سفر میں رہتے ہیں۔

(۲) تیفیناغ : طوارگ قبائلیوں کی زبان کا نام۔

یوسف ادریس

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

کرسی بردار

آپ خواہ اس پر یقین کریں یا نہ کریں، لیکن یہ کہنے پر مجھے معاف فرمانے گا کہ آپ کی رائے میرے نزدیک ذرا بھی اہمیت نہیں رکھتی۔ میرے لیے اتنا کافی ہے کہ میں نے اسے دیکھا، اس سے ملا، اس سے بات کی اور اپنی آنکھوں سے کرسی کا مشاہدہ کیا۔ اس سے مجھے یقین ہوا کہ میں ایک معجزہ دیکھ رہا ہوں۔ لیکن معجزے سے بڑھ کر حیران کن — بلکہ تباہ کن — بات یہ ہے کہ اس شخص، اس کرسی اور اس واقعے نے میدان الاوبرا، شارع جمہوریہ میں یا پورے قاہرہ میں، یا تمام دنیا میں، کسی اور راہگیر کو ایک لمحے کے لیے رُکنے پر بھی مجبور نہ کیا۔

یہ ایک بہت بڑی کرسی تھی۔ اسے دیکھ کر آپ کو گمان ہوا ہوتا کہ یہ کسی اور دنیا سے آئی ہے یا یہ کہ کسی بہت بڑے جلسے کے لیے اس عظیم الشان کرسی کو خاص طور پر تیار کیا گیا ہے؛ چیتے کی کھال اور ریشمیں تکیوں سے ڈھکی ہوئی وسیع و عریض نشست کے ساتھ یہ اپنےآپ میں ایک ادارہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک بار اسے دیکھ لینے کے بعد آپ کی عریضترین خواہش یہ ہوتی کہ اس پر بیٹھ سکیں، ایک بار، صرف ایک لمحے کے لیے بھی۔ کرسی متحرک تھی، شاہانہ وقار سے آگے کی سمت یوں حرکت کر رہی

تھی گویا کسی مذہبی جلوس میں چل رہی ہو۔ آپ کو خیال ہوتا کہ کرسی خودبخود حرکت میں ہے۔ استعجاب اور پست میں آپ اس کے سامنے سجدے میں گر پڑتے اور اس پر عربانیوں کی نذریں گزرانے لگتے۔

لیکن بالآخر مجھے کرسی کے جسیم، چمکتی دھات کی نعلوں جڑے پایوں کے درمیان ایک پانچویں پائے کی جھلک نظر آئی۔ یہ پایہ باقی چار کے مقابلے میں بےحد پتلا تھا اور جسامت اور شان و شکوہ کے اس مظہر کے درمیان عجیب اور بےمحل لگ رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ کوئی پایہ نہیں بلکہ ایک نحیف و نزار انسان تھا جس کے بدن پر پسینے کے بہتے رہنے سے موریاں اور نالیاں سی بن گئی تھیں اور سر پر بالوں کے جنگل کے جنگل آگ آئے تھے۔ مجھ پر یقین کیجیے، میں کسی بھی متبرک چیز کی قسم کھانے کو تیار ہوں، میں نہ جھوٹ بول رہا ہوں اور نہ مبالغہ کر رہا ہوں؛ میں تو صرف ان گھڑ طریقے سے وہی بیان کر رہا ہوں جو میں نے دیکھا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ دبلاپتلا، کمزور آدمی ایسی عظیم الجثہ کرسی کو اٹھائے لیے جا رہا ہو جس کا وزن زیادہ نہیں تو ایک ٹن تو ضرور ہی ہو گا؟ ذہن میں اس کی ایک ہی توجیہہ آتی تھی: یہ کسی طرح کی شعبدہ بازی ہے۔ لیکن آپ تھوڑی دیر تک اور ذرا قریب سے اس کا مشاہدہ کریے تو معلوم ہوتا کہ اس میں کوئی فریب نہیں، کہ وہ آدمی نہ صرف اس کرسی کو واقعی اٹھائے ہوئے ہے بلکہ اسے لے کر آگے بھی بڑھ رہا ہے۔

جو بات اس سے بھی زیادہ غیرمعمولی اور پُراسرار، اور واقعی بےحد چونکانے والی تھی، وہ یہ کہ میدان الاوبرا شارع جمہوریہ میں، بلکہ پورے قاہرہ میں، ایک بھی راہگیر ایسا نہ تھا جسے اس بات نے حیران کیا ہو یا جس نے اس واقعے کو ذرا بھی غیرمعمولی سمجھا ہو؛ وہ سب اسے ایسی عام سی، معمول کی بات سمجھ رہے تھے گویا یہ کرسی نہیں بلکہ کوئی تتلی ہو جسے کوئی چھوٹا سا لڑکا لیے چلا جا رہا ہو۔ میں نے لوگوں کی طرف دیکھا اور پھر کرسی اور اس آدمی پر نظر ڈالی، یہ سوچ کر کہ شاید میں کسی اٹھے ہوئے ابرو یا حیرت سے دبے ہوئے ہونٹ کی جھلک پا سکوں، یا استعجاب کی ہلکی سی چیخ سن سکوں، لیکن کسی ردعمل کا کوئی نشان نہ پایا۔

مجھے یہ تمام معاملہ اس قدر ہولناک محسوس ہونے لگا کہ مزید ایک لمحہ اس پر نظر جمائے رکھنا دشوار ہو گیا۔ عین اس لمحے اس عظیم بوجھ

کو اٹھائے ہوئے وہ آدمی مجھ سے ایک ادھ قدم کی دوری پر تھا، اور میں جھرّیوں کے باوجود اس کے چہرے کی نیک باطنی کو دیکھ سکتا تھا۔ مگر اس کی عمر کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ تب میں نے اس کے جسم پر نظر ڈالی؛ وہ کمر میں بندھی ہوئی ڈوری اور آگے پیچھے اس پر سے لٹکتے ہوئے نادبانی کپڑے کے چیتھڑے کے سوا بالکل برہنہ تھا۔ اس کے باوجود اس کو دیکھ کر اس انکشاف پر آپ کے قدم تھم جاتے کہ یہ شخص نہ صرف قاہرہ شہر میں، بلکہ ہمارے پورے دور میں اجنبی ہے۔ آپ کو حیرت ہوتا کہ اس شکل و صورت کے لوگ آپ نے تاریخ یا آثارقدیمہ کی کتابوں میں دیکھے ہیں۔ اس لیے مجھے سخت حیرت ہوئی جب اس نے، کسی گداگر کے سے مسکین بیدار میں مسکرا کر مجھے دیکھا، اور عجیب سی آواز میں منہ ہی منہ میں بولا:

"بیٹے تمہارے ماں‌باپ پر مہربانی ہو، تم نے کہیں پناہ رع کو تو نہیں دیکھا؟"

کیا وہ قدیم تصویری زبان کو عربی اصوات میں ادا کر رہا تھا یا عربی کو تصویری زبان میں؟ کیا یہ شخص کوئی قدیم مصری تھا؟ میں اس کی طرف مڑا:

"سنو — مجھ سے یہ مت کہنا کہ تم قدیم مصری ہو۔"

"کیا قدیم اور جدید بھی ہوتے ہیں؟ میں مصری ہوں۔"

"اور یہ کرسی کیا ہے؟"

"یہ وہ ہے جسے میں نے اٹھا رکھا ہے۔ تمہارے خیال میں میں پناہ رع کو کیوں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں؟ اس لیے کہ شاید وہ مجھے اس کرسی کو اتار کر نیچے رکھنے کا حکم دے، جس طرح اس نے مجھے اس کو اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ میں تھک کر چُور ہو گیا ہوں۔"

"کیا تم بہت دیر سے اسے اٹھائے ہوئے ہو؟"

"بہت دیر سے، تم اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔"

"ایک سال؟"

"ایک سال سے تمہاری کیا مراد ہے بیٹے؟ کوئی پوچھے تو اس سے کہنا، ایک سال اور چند ہزار۔"

"ہزار کیا؟"

"سال۔"

"مثلاً اہرام کے زمانے سے؟"

"اس سے بھی پہلے سے۔ نیل کے زمانے سے۔"

"نیل کے زمانے سے؟ کیا مطلب؟"

"اس زمانے سے جب نیل کو نیل نہیں کہا جاتا تھا، اور مرکز کو پہاڑوں سے دریا کے کنارے پر منتقل کیا گیا تھا۔ تب پناہ رع نے مجھے بلایا اور کہا: حمال، اسے اٹھا لے۔ میں نے اسے اٹھا لیا اور اس وقت سے اسے اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہوں اور پناہ رع کو ڈھونڈ رہا ہوں تاکہ وہ مجھے اس کو اتارنے کا حکم دے، مگر اس دن سے اب تک وہ مجھے دکھائی نہیں دیا۔"

استعجاب کی صلاحیت یا خواہش محفل میں بالکل ختم ہو چکی تھی۔ جو شخص اس جسامت یا وزن کی کرسی کو ایک لمحے کے لیے بھی اٹھانے پر قادر ہو، وہ اسے ہر روز سال بھی اٹھائے پھر سکتا ہے۔ تعجب یا احتجاج کا نہ کوئی موقع نہ تھا۔ صرف ایک سوال کیا جا سکتا تھا:

"اور فرض کرو تمھاری پناہ رع سے ملاقات نہ ہو سکے، تو کیا تم اسے اٹھائے گھومتے رہو گے؟"

"اور کیا کروں گا؟ میں نے اسے اٹھا رکھا ہے اور اسے میرے سپرد کیا گیا ہے۔ مجھے اس کو اٹھانے کا حکم دیا گیا تھا، تو میں حکم کے بغیر کیونکر اسے اتار سکتا ہوں؟"

شاید یہ غصے کی لہر تھی جس سے مغلوب ہو کر میں نے کہا "اسے اتارو۔ کیا تمھارا جی نہیں بھرا؟ بندۂ خدا، تم تھکے نہیں؟ پھینک دو اسے، توڑ ڈالو، جلا دو۔ کرسیاں اس لیے بنائی جاتی ہیں کہ لوگوں کو اٹھائیں، نہ کہ لوگ انھیں اٹھائے پھریں۔"

"میں ایسا نہیں کر سکتا۔ کیا تمھارے خیال میں میں اسے تفریح کی غرض سے اٹھائے پھر رہا ہوں؟ میں اپنی روزی اسی طرح کماتا ہوں۔"

"تو کیا ہوا؟ جب تم دیکھ رہے ہو کہ یہ تمھیں تھک کر چُور کر رہی ہے، تمھاری کمر توڑے دے رہی ہے، تو تمھیں اس کو اتار پھینکنا چاہیے۔ تمھیں تو یہ کام زمانوں پہلے کر لینا چاہیے تھا۔"

"تم تو ایسا ہی کہو گے، کیونکہ تم اس قصّے سے باہر اور محفوظ ہو۔ اس کا بوجھ تمھارے سر پر نہیں ہے، تو تمھیں کیا پروا۔ اسے میں نے اٹھا رکھا ہے کیونکہ اسے میرے سپرد کیا گیا تھا، اس کی ذمےداری مجھ پر ہے۔"

"خدا کی پناہ، مگر آخر کب تک؟"

"جب تک پتاہ رع مجھے حکم نہ دے۔"

"وہ کب کا مر کھپ چکا۔"

"تو اس کا وارث اس کا نائب، اس کا کوئی خلف، کوئی بھی شخص جسے اس کی طرف سے اس کا اختیار حاصل ہو۔"

"تو ٹھیک ہے، میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ اسی وقت اسے نیچے رکھ دو۔"

"تمھارے حکم کی تعمیل ہو گی ۔اور تمھاری دردمندی کا بھی بےحد شکریہ۔ لیکن کیا تم اس کے خاندان سے ہو؟"

"بدقسمتی سے ایسا نہیں ہے۔"

"کیا تمھارے پاس اس کا اختیارنامہ ہے؟"

"نہیں۔"

"تو پھر مجھے میری راہ جانے دو۔"

اس نے چلنا شروع کر دیا تھا، لیکن میں نے چلا کر اسے روک لیا کیونکہ میری نظر اس شے پر پڑ گئی تھی جو ایک اعلان کی شکل میں کرسی کے سامنے والے حصّے پر چسپاں تھی۔ درحقیقت یہ ہرن کی کھال کا ایک ٹکڑا تھا جس پر قدیم رسم الخط میں کوئی عبارت درج تھی اور وہ آسمانی کتابوں کے اولیں صحیفوں کی طرح لگ رہا تھا۔ میں بہت دشواری سے یہ عبارت پڑھ سکا:

اے کرسی بردار
بہت دیر تو نے یہ بوجھ اٹھایا
اور اب وقت آ گیا ہے کہ کوئی کرسی تیرا بوجھ اٹھائے
یہ عظیم و جسیم کرسی
جس کی مثیل کبھی تیار نہیں ہوئی
تیرے ہی لیے ہے
اسے اٹھا لے
اور اپنے گھر لے جا
اسے کسی ممتاز مقام پر رکھ
اور عمر بھر اس پر نشست کر
تیرے دشمن کے جانشیں پر

یہ میرے بیٹوں کی ملکیت ہے

"میرے برادر، کرسی بردار، بے پناہ رب کا فرمان ہے! اس کا واضح حکم جو اسی وقت جاری ہوا تھا جب اس نے تمھیں کرسی اٹھانے کا حکم دیا تھا۔ اس پر اس کے دستخط ہیں اور اسے اس کے خرطوشے سے مُہر کیا گیا ہے۔"

میں نے یہ سب اس سے بےحد مسرّت کے عالم میں کہا، کسی ایسے شخص کی سی مسرت جو طویل حبس سے باہر آیا ہو۔ جس لمحے سے میں نے کرسی کو دیکھا تھا اور یہ قصہ سنا تھا، میں یوں محسوس کر رہا تھا گویا یہ بوجھ مجھی پر ہے اور ہزاروں سال سے مجھی پر رہا ہے! گویا وہ میری ہی کمر ہے جو ٹوٹی جا رہی ہے، اور جو مسرت مجھ پر طاری ہے وہ اس بوجھ سے بالآخر رہا ہو جانے پر میری اپنی مسرّت ہے۔

وہ شخص سر جھکائے میری بات سنتا رہا، کسی جذبے کی ایک رمق تک سے عاری؛ وہ فقط سر جھکائے میری بات پوری ہونے کا انتظار کرتا رہا، اور جیسے ہی میں نے اپنی بات ختم کی اس نے اپنا سر اٹھایا۔ میں اس سے اپنی جیسی مسرت، بلکہ سرخوشی کے اظہار کی توقع کر رہا تھا، لیکن مجھے کوئی ردعمل دکھائی نہ دیا۔

"یہ فرمان ٹھیک تمھارے سر کے اوپر لکھا ہوا ہے ۔۔ مہیب رمزوں میں۔"

"مگر میں تو پڑھنا نہیں جانتا۔"

"مگر میں نے تمھیں پڑھ کر سنا دیا ہے۔"

"میں تمھاری بات پر یقین کر لیتا اگر تمھارے پاس اختیارنامہ ہوتا۔ ہے تمھارے پاس؟"

جب میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ غصے سے کچھ بڑبڑاتا ہوا جانے کو مڑا۔

"لوگوں کو بلاوجہ راہ کھوٹی کرنے کے سوا کوئی کام نہیں۔ اس قدر بھاری بوجھ ہے اور دن بھر میں ایک چکر بھی پورا نہیں ہو پاتا۔"

میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ کرسی اپنی سست اور ہموار رفتار سے حرکت کرنے لگی تھی، جسے دیکھ کر لگتا تھا کہ خودبخود حرکت میں ہے۔ وہ شخص ایک بار پھر اس کا پانچواں پایہ بن گیا تھا جس کے بل پر کرسی متحرک تھی۔

میں کھڑا اسے، پسینے سے تر ہوتے، ہانپتے اور کراہتے ہوئے دور جاتے

Scanned with CamScanner

دیکھتا رہا۔

میں ٹک ٹک کھڑا تھا، خود سے سوال کر رہا تھا کہ آیا مجھے دوڑ کر اسے جا لینا اور مار ڈالنا چاہیے، تاکہ اپنے غضب کا اظہار کر سکوں۔ کیا مجھے دوڑ کر کرسی کو زبردستی اس کے کندھوں پر سے دھکیل کر نیچے گرا دینا چاہیے اور اسے آرام کرنے کے لیے بٹھا دینا چاہیے؟ یا مجھے اس کے لیے صرف طنز آمیز جھنجھلاہٹ پر اکتفا کرنا چاہیے؟ یا مجھے اپنے غیظ پر قابو پا کر اس کے لیے صرف تاسّف محسوس کرنا چاہیے؟

یا پھر مجھے اس بات کے لیے خود کو قصوروار ٹھہرانا چاہیے کہ مجھے علم نہیں کہ اختیارنامہ کیا ہوتا ہے؟

یوسف ادریس

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

بیت اللّحم

چراغ کے پاس رکھی ہوئی انگوٹھی--- خاموشی بوجھل ہے، کان اندھے ہو جاتے ہیں۔ انگلیاں دُزدانہ حرکت کرتی ہیں، خاموشی سے انگوٹھی کو گرفت میں لیتی ہیں اور روشنی گُل کر دیتی ہیں۔ اندھیرا مسلط ہو جاتا ہے اور اندھیرے میں آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ عورت، اُس کی تین بیٹیاں اور اُن کا مکان، محض ایک کمرہ۔

ابتدا خاموشی ہے۔ بیوہ دراز قد، گوری جلد اور چھریرے بدن والی ہے، عمر تقریباً پینتیس سال۔ اُس کی بیٹیاں بھی لمبی اور تندرست ہیں۔ انھوں نے اب تک سوگ کا سیاہ لباس پہن رکھا ہے۔ ان میں سب سے چھوٹی سولہ سال کی ہے، سب سے بڑی تیس کے لگ بھگ۔ تینوں کم رُو ہیں، انھوں نے اپنی گہری رنگت اور بدصورتی، فربہ اور بےڈول جسم باپ سے اور قد ماں سے پایا ہے۔ کمرہ اپنی تنگی کے باوجود دن بھر انھیں اپنے اندر سمیٹے رکھتا ہے۔ انتہائی مفلسی کے باوجود کمرہ سجا ہے، عزت اور آسائش کے انداز میں، آراستہ ہے اور نسوانی لمس کا پتا دیتا ہے۔ جب رات آتی ہے تو اُن کے جسم پورے کمرے میں پھیل جاتے ہیں۔ گرم، دھڑکتے ہوئے گوشت کے بڑے بڑے

ڈھیر سب بستر یا دیوان پر پسرے ہوئے؛ سانس لیتے اور ہانپتے ہوئے گہری بےخوابی کے شکار۔

خاموشی اس گھر پر دو سال سے منڈلا رہی ہے جب مرد نے طویل بیماری کے بعد جان دی۔ سوگ کا عرصہ گزر گیا لیکن سوگواروں کی عادتیں قائم رہیں جن میں سب سے حاوی عادت خاموشی کی تھی۔ یہ درحقیقت انتظار کی خاموشی تھی، کیوں‌کہ لڑکیاں جوان ہو رہی تھیں اور انتظار کا عرصہ اُن پر بوجھل ہو رہا تھا۔ دروازے پر خواستگار دستک نہیں دیتے تھے۔ کون شخص ہو گا جو غربت، کم رُو لڑکیوں کے دروازے پر دستک دے، خاص طور پر جب وہ یتیم بھی ہوں؟ لیکن بےشک امید اب تک برقرار تھی (شراب اپنے خریدار کے آنے تک مٹکے میں پڑی رہ سکتی ہے)، اور ان میں سے ہر لڑکی کو یقین تھا کہ قسمت بدل جائے گی۔ (کوئی کتنی ہی غریب کیوں نہ ہو کوئی نہ کوئی اُس سے بھی زیادہ غریب ضرور ہو گا، اور اگر بدصورتی عالم ہے تو کوئی نہ کوئی اور زیادہ بدصورت بھی ہو گا... اور اگر صبر کیا جائے تو خواب پورے ہو جاتے ہیں...)

خاموشی کبھی کبھی قرآن پڑھنے کی آواز سے ٹوٹتی تھی؛ یکساں، اور صدیوں سے عاری آواز؛ قاری کی آواز۔ قاری اندھا ہے، مگر تلاوت مرنے والے کی روح کو ثواب پہنچانے کے لیے کی جاتی ہے، ہمیشہ اپنے معین وقت پر۔ ہر جمعے کی سہ پہر کو وہ اپنی چھڑی سے ٹٹولتا ہوا دروازے پر آتا ہے۔ وہ خود کو بڑھے ہوئے ہاتھ کے سپرد کر دیتا ہے جو اسے اندر لے آتا ہے۔ اندر آ کر وہ چٹائی پر دوزانو بیٹھ کر تلاوت کرنے لگتا ہے۔ تلاوت پوری ہونے پر وہ ٹٹول کر اپنے جوتے اٹھاتا ہے، سلام کرتا ہے جس کا جواب دینے کی زحمت کوئی نہیں کرتا اور چلا جاتا ہے۔ وہ عادتاً آتا ہے، عادتاً تلاوت کرتا ہے اور عادتاً چلا جاتا ہے۔ کوئی اُس کے وجود کو محسوس نہیں کرتا

خاموشی ہر وقت قائم رہتی ہے... اُس وقت بھی جب تلاوت کی آواز اسے پارہ پارہ کر رہی ہو۔ گویا خاموشی ہی خاموشی کو توڑتی ہے۔ ہمیشہ کا انتظار کم زور لیکن مسلسل امید، کیوں‌کہ امید ہر حقیر مخلوق کے لیے موجود ہے، کوئی نہ کوئی اُس سے زیادہ حقیر بھی ہو گا۔ اور انھیں بہت زیادہ کی آرزو بھی نہیں ہے، نہیں انھیں آرزو نہیں ہے۔

خاموشی قائم رہی جب تک تبدیلی واقع نہ ہوئی اُس جمعے تک جب قاری نہیں آیا۔ ہر معاہدہ، خواہ وہ کیسے ہی طویل عرصے تک قائم رہا ہو آخر

ختم ہو جاتا ہے، اور عملاً یہ معاہدہ بھی ختم ہو گیا تھا۔ تب بیوہ اور اُس کی بیٹیوں کو احساس ہوا کہ اس کی آواز نہ صرف گھر کی تنہا مردانہ آواز تھی جو ہفتے میں ایک بار خاموشی کو توڑتی تھی، بلکہ وہ واحد مرد تھا جو اُن کے دروازے پر دستک دیتا تھا۔ اُن پر اور باتیں بھی عیاں ہونے لگیں۔ ہاں، وہ انھی کی طرح مفلس تھا، لیکن اُس کا لباس ہمیشہ صاف، جوتے ہمیشہ چمکتے ہوئے اور عمامہ ہمیشہ اچھی طرح بندھا ہوا ہوتا تھا (جو کسی بھی آنکھوں والے مرد کو شرمندہ کر دیتا) اور سب سے بڑھ کر، اس کی آواز طاقت ور، گونج دار اور مترنم تھی۔ یہ خیال ہوا میں منڈلانے لگا: معاہدے کی تجدید کیوں نہ کر لی جائے، اور اُسے فوراً بلوا کیوں نہ لیا جائے؟ کیا وہ کہیں اور مصروف ہو گیا ہے؟ وہ انتظار کر لیں گی، کیوں کہ انتظار کے قدیم کھیل میں انھیں بہت مہارت ہے۔

شام اپنے اختتام پر تھی، اور وہ، گویا پہلی بار، تلاوت کر رہا تھا۔ تب یہ تجویز سامنے آئی: کیوں نہ اُن میں سے کوئی ایک اس مرد سے شادی کر لے جس کی آواز گھر کو بھر دیا کرے؟

وہ کنوارا تھا جس کی سمتیں بھٹک رہی تھیں، وہ نوجوان تھا۔ لفظوں سے لفظ جنم لیتے ہیں، اور وہ بھی کسی مناسب عورت کی تلاش میں تھا۔ لڑکیاں اس معاملے پر آپس میں مشورہ کرتی ہیں اور ماں ان کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ان میں سے کون اس خوش نصیبی کی مستحق ٹھہرے گی۔ لیکن ان کے چہرے اس کی متجسس نظروں سے گریزاں ہیں اور یہ کہتے ہوئے مغموم ہوتے ہیں، کیا ہمارے طویل انتظار کا صلہ یہ ہے؟ کیا ہمیں اپنا روزہ ایک اندھے مرد سے افطار کرنا ہو گا؟ کیوں کہ وہ اب تک خواستگاروں کے آنے کا خواب دیکھتی ہیں، اور خواستگار عموماً آنکھوں والے نوجوان مرد ہوتے ہیں۔ بے چاریوں کو ابھی مردوں کی دنیا کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ اپنی زندگیوں کے اس حصے میں ان کے لیے یہ جاننا ناممکن ہے کہ مرد کو جانچنے کا پیمانہ فقط بینائی نہیں ہے۔

"امّاں، تم اس سے شادی کر لو۔۔۔ تم کر لو۔"

"میں؟ کیسی شرم کی بات ہے! لوگ کیا کہیں گے؟"

"لوگ جو کچھ کہتے ہیں کہنے دو۔ یہ بہرحال گھر میں مرد کے بغیر، مرد کی آواز کی گونج کے بغیر رہنے سے بہتر ہو گا۔"

"کیا تم چاہتی ہو کہ میں تم سے پہلے شادی کر لوں؟ یہ کبھی نہیں ہو

سکے..."

"کیا تمہارا ہم سے پہلے شادی کرنا بہتر نہیں ہو گا، تاکہ ہمارے گھر میں مردوں کا تانتا شروع ہو جائے؟ پھر ہماری بھی شادیاں ہو سکتی ہیں۔"

"شادی کر لو، اماں، اس سے شادی کر لو..."

اور ماں نے اس سے شادی کر لی... ہوا میں ایک اور سانس شامل ہو گیا اور اُن کی آمدنی میں بھی تھوڑا سا اضافہ ہو گیا، اور ایک اس سے بھی بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ یہ درست ہے کہ ان دونوں نے اپنی پہلی رات کسی طرح کاٹ ہی لی، پھر وہ اندھیرے میں بھی، ایک دوسرے کے قریب نہ آ سکے۔ لڑکیاں سو رہی تھیں یا سوتی بن رہی تھیں، لیکن ماں کریدتی ہوئی سی نظروں کی شعاعوں کو، جانوروں کے چوکنے محاسوں کی طرح، درمیان کی خالی جگہ کو ٹٹولتا محسوس کر رہی تھی۔ لڑکیاں اتنی بڑی ہو چکی تھیں کہ سب کچھ سمجھ سکیں، اور کمرہ یک لخت دن کی روشنی میں جھلملاتے ہوئے، جسموں اور دھڑکتے ہوئے وجودوں میں منقلب ہو گیا ہے۔

جب صبح ہوتی تو سب، ایک ایک کر کے، گھر سے نکل گئیں اور مغرب کے وقت ہچکچاتی ہوئی گھبرائی ہوئی واپس لوٹیں۔ وہ اپنے پیروں کو گھسیٹتی ہوئی، ہنسی کی آواز سے بھرے ہوئے مکان میں داخل ہوئیں؛ اس ہنسی کا تسلسل کبھی کبھی ایک عورت کی دھیمی آواز سے ٹوٹتا تھا۔ ضرور ماں کی ہنسی ہو گی اور وہ جس محترم قاری سے واقف تھیں وہ بھی اب ہنس رہا تھا۔ ننگے سر، کنگھے بال، اور ہاتھ میں کنگھی لیے ہوئے اور اب تک ہنستے ہوئے، ماں نے انہیں خوش آمدید کہا۔ انہوں نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی اور انہیں اندازہ ہوا کہ ان برسوں میں یہ ایک بجھا ہوا چراغ رہا تھا جس کے کونوں میں چھپکلیوں اور مکڑیوں نے گھر سا بنا لیا تھا۔ اب یہ چہرہ یک دم روشن ہو گیا تھا اور آنسوؤں سے تھکی ہوئی آنکھوں کی جگہ اب وہاں ہنسی سے چھلکتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ خاموشی مکمل طور پر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ رات کے کھانے کا وقت اونچی آوازوں، شوخیوں، قاری کی پرجوش تھرتھراتی ہوئی دلکش آواز میں اُم کلثوم اور عبدالوہاب کی نغموں سے پُر رہا۔

بہت جلد اماں نے چہل پہل اور ہنسی جلد ہی اور مردوں کو جو گھر کی حسرت ختم کر دے گی، کیونکہ مرد کی موجودگی اور مردوں کے نے

کا باعث بنتی ہے۔

لڑکیو یقین رکھو۔ جلد ہی مردوں کا آنا جانا شروع ہو گا اور رشتے آنے لگیں گے۔ لیکن حقیقت میں اُس کے ذہن پر رشتے لانے والے مردوں کا نہیں بلکہ اس نوجوان کا غلبہ تھا۔ وہ اندھا ضرور تھا لیکن کسی کا اندھا ہونا نہیں اُس کو دیکھنے سے کس طرح باز رکھ سکتا ہے؟ ہاں، وہ اس تندرست نوجوان کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی چھلکتی ہوئی قوت نے بیماری اور بےبسی کے برسوں اور اُس کے قبل از وقت بڑھاپے کی تلافی کر دی تھی۔

خاموشی کبھی نہ لوٹنے کے لیے جا چکی تھی، اور اس کی جگہ زندگی کی ہلچل نے لے لی تھی۔ یہ مرد قانونی طور پر اس کا خاوند ہے، اس نے خدا کے قانون اور رسول کی سنت کے مطابق اس سے نکاح کیا ہے۔ نہیں، اسے کسی بات پر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ اُس نے قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کیا؛ حتیٰ کہ اُس وقت بھی جب وہ کسی عمل کو راز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتی، یا جب رات آتی ہے اور وہ سب ساتھ پڑے ہوتے ہیں، اور جب بدن اور روح کی قوت مغلوب کر لیتی ہے، خواہ لڑکیاں اپنی کمیں گاہوں میں بیدار اور ہوشیار ہوں اور آہوں اور کراہوں کو قابو میں رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

اس کی صبحیں مال دار لوگوں کے گھر کپڑے دھونے میں گزرتی تھیں، اور اُس کا دن عرسوں کے گھر قرآن کی تلاوت کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

شروع شروع میں وہ دن کے درمیانی وقفے میں گھر نہیں لوٹتا تھا، مگر جوں جوں اس کی راتیں طویل ہونے لگیں، اس نے اپنے تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے، اور رات کے لیے اپنی قوت بحال کرنے کے لیے گھر آنا شروع کر دیا۔

اور ایک بار، جب وہ رات سے سیر ہو چکے اور رات اُن سے سیر ہو چکی، تو اچانک اس نے عورت سے سوال کیا کہ اسے دوپہروں میں کیا ہو جاتا ہے ایسا کیوں ہے کہ وہ رات میں اتنی باتونی اور بولنے کے لیے بےقرار ہوتی ہے اور اُس وقت بالکل چپ سادھ لیتی ہے؟ اُس نے مرد کی پسندیدہ انگوٹھی ـ اُس کی جانب سے شادی کا تحفہ، جہیز اور مہر ـ اس وقت کیوں نہیں رکھی ہے اور دوپہر کو وہ اسے کیوں اتار دیتی ہے؟

اگر وہ اپنے اوسان کھو کر خود کو الگ کر لیتی ہوش و حواس سے بیگانہ ہو کر چلانے لگتی تو روا تھا۔ اگر وہ خود کو ہلاک کر لیتی تو بھی بجا

Scanned with CamScanner

تھا، کیوں کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس کا ایک ہی مفہوم تھا، اور وہ نہایت ہولناک اور سفاک تھا۔ ایک گھٹی ہوئی سسکی نے اس تمام ردعمل کی راہ روک دی۔ اس نے سانس روک لیا اور مشتعل نہ ہوئی۔ اس نے اپنے کانوں کو آنکھوں، ناک اور تمام حسوں کے اعصاب میں بدل لیا، اور اپنے ایک ایک ریشے میں تناؤ پیدا کر کے یہ پتا چلانے کی کوشش کی کہ اُن بیٹیوں میں سے مجرم کون ہے۔ کسی سبب سے اسے یقین تھا کہ یہ حرکت منجھلی کی ہے، کیوں کہ اُس کی آنکھوں میں ایسی سرکشی نظر آنے لگی تھی جس کا خاتمہ صرف بندوق کی گولی سے ممکن تھا۔ لیکن ماں نے اپنے کان لگائے رکھے۔ بیٹیوں کی سانسیں بھاری، تیز اور گرم، شعلہ بار، محجوب اور ناہموار ہو گئیں اور جوانی کے اُن خوابوں سے سنسنانے لگیں جن میں مداخلت کرنا ناقابلِ معافی ہوتا!

بھاری سانسیں رفتہ رفتہ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں، پیاسی زمین سے اٹھتے ہوئے لاوے میں ڈھلنے لگی ہیں۔ اس کے حلق میں پیدا ہونے والی گرہیں گہری اترنے لگی ہیں اور اس کا دم گھٹنے لگتا ہے۔ اپنے رشتوں کے تمام تناؤ کے باوجود وہ دھڑکتے ہوئے گرم گوشت کے ایک ڈھیر اور دوسرے ڈھیر میں تمیز کرنے میں ناکام رہی ہے۔ بیٹیاں بھوکی ہیں۔ بیٹیاں ہانپتی اور کراہتی ہیں۔ اور یہ کراہیں صرف کراہیں نہیں ہیں۔ یہ سسکیاں ہیں یا شاید التجائیں، یا شاید اس سے بھی بڑھ کر۔

اس نے خود کو پوری طرح اپنے دوسرے قانونی حق کے سپرد کر دیا ہے، اور لڑکیوں کو، اپنے پہلے قانونی فرض کو بالکل فراموش کر دیا ہے۔ صبر نے دستِ مُر کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب خوابگزاروں کی سرابیں بھی باقی نہیں رہیں۔ یکایک، جیسے انہیں کسی تیز نے کاٹ لیا ہو، یا کسی رازدارانہ پکار پر ان کی آنکھ کھل گئی ہو، لڑکیاں بھوک سے بےتاب ہو اٹھی ہیں۔ یہ حرام غذا ہے، لیکن بھوک اس سے بھی بڑھ کر گناہ آلود ہے۔ اس بھوک سے زیادہ گناہ آلود کوئی چیز نہیں ہے۔ وہ اس سے کسی اچھی طرح واقف ہے۔ اور یہ بھوک اس سے کسی اچھی طرح واقف ہے اس نے اس کی روح کو آزاد کیا ہے۔ اس کی ہڈیاں کھوکھلی ہیں۔ وہ اس بھوک سے واقف ہے۔ اب جب اس کی اپنی بھوک مٹ چکی ہے اس کے لیے اس کو بھلانا ناممکن ہے۔

بیٹیاں بھوک سے بےتاب؛ وہ جس نے اپنے منہ کا نوالہ نکال کر اُن کا پیٹ بھرا، وہ جس کا واحد مقصد خود کو بھوکا رکھ کر انہیں کھانا کھلانا

تھا، وہ جو ماں ہے ۔۔ کیا اسے یاد نہیں رہا؟

اور مرد کے مطالبوں میں اصرار خواہ کتنا ہی بڑھ گیا ہو، اس کا درد خاموشی میں بدل گیا۔ ماں خاموش ہو گئی اور اس لمحے کے بعد سے خاموشی نے کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ صبح ناشتے پر، بالکل جس طرح اس نے سوچا تھا، منجھلی خاموش تھی اور اس کے بعد بھی خاموش رہی۔ رات کے کھانے پر نوجوان مرد مسرور اور زندہ دلی سے بھرپور، نابینا اور خوش تھا، ہنس رہا تھا اور گا رہا تھا، اور صرف چھوٹی اور بڑی اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔

صبر کا امتحان لیا جاتا ہے اور اس کی تلخی مرض بن جاتی ہے، اور کوئی شخص آ کر دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا۔ ایک دن بڑی لڑکی ماں کی انگوٹھی کو دیکھ کر تحسین کا اظہار کرتی ہے، اور ماں کا دل ڈوب جاتا ہے؛ اور جب بڑی صرف دن بھر کے لیے اسے پہنے کی فرمائش کرتی ہے تو ماں کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔ ماں خاموشی سے اسے اپنی انگلی سے اتار دیتی ہے اور لڑکی خاموشی سے اسے اپنی انگلی میں پہن لیتی ہے۔

اور اس رات بڑی لڑکی خاموش رہتی ہے اور ایک لفظ منہ سے نہیں نکالتی۔

اور نابینا مرد گا رہا ہے اور زور زور سے ہنس رہا ہے، اور صرف منجھلی اس کا ساتھ دے رہی ہے۔

پھل نہ پانے والا صبر اور سرد سے نہ بدلنے والی قسمت چھوٹی لڑکی کو بھی بڑا کر دیتی ہے، اور اپنی باری پر وہ بھی انگوٹھی کی فرمائش کرتی ہے، اور خاموشی سے اس کی بھی باری آ جاتی ہے۔

انگوٹھی چراغ کے پاس رکھی ہے اور خاموشی چھا جاتی ہے اور کان اندھے ہو جاتے ہیں، اور جس کی باری ہے وہ انگلی دُردانہ حرکت کر کے خاموشی سے انگوٹھی کو گرفت میں لیتی ہے اور روشنی گل کر دیتی ہے۔

اندھیرا مسلط ہو جاتا ہے اور اندھیرے میں آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ صرف اندھا نوجوان مرد خوش رہتا ہے۔ لیکن اپنی اونچی آواز اور قہقہوں کے پیچھے وہ اس خاموشی کے ہاتھوں اُلجھن میں رہتا ہے، بےیقینی کا عذاب جھیلتا ہے۔ شروع میں وہ خود سے کہتا تھا ہمیشہ بدلتے رہنا غالباً

عورت کی صورت ہوتی ہو گی۔ کبھی وہ صبح کی اوس کی طرح تازہ ہوتی ہے، کبھی دلدلی پانیوں کی طرح بوجھل اور تھکی ہوئی۔ کبھی گلاب کی پتی کی طرح نرم، کبھی تھوہر کی طرح کانٹےدار۔ انگوٹھی تو ہر بار وہی ہوتی ہے، لیکن انگلی ہر بار مختلف لگتی ہے۔ اسے کم و بیش یقین تھا کہ انھیں سب کچھ معلوم ہے۔ تو پھر خاموشی ٹوٹتی کیوں نہیں؟ ہوتی کیوں نہیں؟ اس خیال کے آتے ہی سوال اس کے حلق میں پھنس گیا۔ اور اس لمحے کے بعد سے اس نے ایک لفظ منھ سے نہ نکالا۔ وہ اس بےبسی کی حد پار کرنے کے خیال کے ہاتھوں خوف کے نرغے میں رہا۔ اس دور خاموشی مختلف تھی، سب اس کا احترام کرتے تھے۔ شعوری خاموشی یعنی نا صبر یا مایوسی سے پیدا ہونے والی خاموشی نہیں بلکہ سب سے زیادہ گہری سب سے زندہ لازم کسی رسمی معاہدے کے بغیر باعد کی ہوئی خاموشی۔ بیوہ اور اس کی مس مشال اور مکان جو محض ایک کمرہ تھا۔ یہ نئی طرح کی خاموشی تھی یہ خاموشی اندھے قاری کی جانب سے آئی تھی جس نے خاموشی سے خود کو یقین دلا لیا تھا کہ سفر میں اس کے ساتھ ہمیشہ اس کی قانونی بیوی ہوتی ہے اس کی دی ہوئی انگوٹھی کی مالک، ہمیشہ بدلتی رہنے والی، ہر بار نئی۔ جوان اور عمر رسیدہ، ریشم جیسی نرم یا بےحس اور کھُردری کبھی غریب اور کبھی دمی بنی؛ جو بھی کچھ ہو، اصلیت اسی کا مسئلہ ہے۔ درحقیقت یہ سب کچھ آنکھوں والوں کا مسئلہ ہے اور انھیں کی ذمہ داری ہے۔

کیوں کہ صرف انھیں کو یقین کا انعام حاصل ہے؛ وہی اسرار کے اہل ہیں جبکہ وہ صرف شک کو جان سکتا ہے، شک جسے صرف بینائی کی نعمت دور کر سکتی ہے۔ جب تک وہ اس نعمت سے محروم ہے، یقین سے بھی محروم رہے گا، کیوں کہ وہی اندھا ہے اور اندھوں کے لیے کوئی شرم نہیں۔

یا ہے؟

یوسف شارونی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

موجود عبدالموجود کی زندگی کی جھلکیاں
مع دو عدد پس نوشت

دونوں شمعیں بجھ گئیں: لڑکی اور اس کی ماں -- میری بیوی اور میری داشتہ -- اور چیلوں کے سوا کچھ باقی نہیں بچا۔

میں فلسفے کا استاد ہوں اور اس سے پہلے بہت لمبے عرصے تک فلسفے کا طالب علم رہا ہوں -- مگر ہمیں کہانی کو اس کے انجام سے شروع کرنا چاہیے۔

میں کمرے میں اکیلا ہوں۔ تنہا اداس کمرہ، وسیع چھت پر واقع، جہاں مکان میں رہنے والوں کے کپڑے سکھانے کے لیے رسیاں آڑی ترچھی بندھی ہوئی ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی، کبھی متوازی چلتی اور تکون اور چوکور بناتی ہوئی۔ میرے کمرے میں زیادہ فرنیچر نہیں ہے: ایک کرسی جس کے تختے پر میں بیٹھا ہوں اور پشت پر اپنا کپڑوں کا جوڑا لٹکاتا ہوں؛ لکھنے اور کھانے کی ایک میز؛ ایک صوفہ جس پر دن میں میرے ملنے والے بیٹھتے ہیں اور رات کو میں سوتا ہوں؛ ایک پیالہ جس سے میں کبھی پیتا ہوں اور کبھی اس میں مونگ پھلیاں رکھ لیتا ہوں جو مجھے بہت مرغوب ہیں۔

Scanned with CamScanner

میرے کمرے کی ہر چیز دوبارا استعمال رکھتی ہے، یہاں تک کہ اخبار بھی جسے لڑکا ہر روز دروازے کے نیچے سے پھینک جاتا ہے اور جس میں میں اپنے سرا پانے کی خبر تلاش کرتا ہوں، میزپوش کے طور پر کام آتا ہے۔ مگر ہمیں کہانی کو اس کے انجام سے شروع کرنا چاہیے۔

میں رات سے کس قدر دہشت زدہ ہوں؟ رات کس قدر غم ناک ہے؟ رات کا آغاز مجھے نہیں دہلاتا، بلکہ آخری حصّہ۔ شروع رات میں میں اپنے خوف سے بچ نکلتا ہوں، جب کھانے کے فوراً بعد، خواہ میں نے کیسا ہی ہلکا کھانا کھایا ہو، گہری نیند مجھے آ لیتی ہے، جیسے میں نے کوئی نہایت تیز نشہ آور دوا پی لی ہو۔ مگر زیادہ دیر نہیں گزرتی کہ مجھ پر انکشاف ہوتا ہے کہ میں ایک مکروہ فریب کا شکار تھا، کیوں کہ تین یا چار بجے میں چونک کر جاگ اٹھتا ہوں۔ جب رات کی خاموشی دن کے غل سے زیادہ پُرشور ہو جاتی ہے: کتے کا بھونکنا، مینڈک کا ٹرانا، گھنٹے کی آواز، چیزوں کے ٹوٹنے کا شور، اپنی طرف آتے ہوئے قدموں کی چاپ، اور اُس ہونی کا دھڑکا جو ہونے کو ہے، ہوتی نہیں مگر ہو کر رہے گی۔ میرے ذہن میں ایک خیال چکر کاٹتا ہے مجھ سے کہتا ہے: اپنی اس صورت حال کی ایک حد مقرر کر لے، اس کا ایک حل طے کر لے؛ جب دن خدا کی مخلوق سے بھرا ہوا ہو، اپنے کمرے کی کھڑکیاں کھول کر اپنے جرم کا اعلان کر دے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے لیے سب سے بہتر بات یہ ہے کہ کسی شوروغل کے بغیر پولیس اسٹیشن جا کر اعتراف کر لے۔ مگر کیا اعتراف کروں؟ یہ اعتراف کروں کہ میں نفس سے نہیں کہہ سکتا کہ کس بات کا اعتراف کرنے آیا ہوں؟ لیکن تم کب سمجھتے ہو، وہ میرے خود وہاں جانے کے انتظار میں رہیں گے؟ شاید وہ آ رہے ہوں گے، مگر ایسا نہ ہوتا تو کتا کیوں بھونکتا، قدموں کی چاپ کیوں سنائی دیتی؟ بےخوابی اور کرب کی یہ کیفیت کتنی ہولناک ہے؟ صبح اس عقوبت سے مجھے رہائی دلاتی ہے۔ مرغ بانگ دیتے ہیں، چڑیاں چہچہاتی ہیں۔ اور اندھیرے کا ڈراؤنا خواب دور ہو جاتا ہے۔

اب سے دور کسی زمانے میں، ایک صبح میں کالج جانے کے لیے سیڑھیاں

اتر رہا تھا کہ مجھے ایک ناگوار بُو محسوس ہوئی۔ پہلے میں نے سوچا کہ کسی مرے ہوئے کتے یا بلی کی بدبو ہے، یا مکان میں رہنے والے بچوں نے کسی چوہے کو مار کر چکردار زینے کی تہہ میں پھینک دیا ہے۔ لیکن چند روز پہلے شیخ مدیحہ کی گم شدگی کے خیال نے میرے ذہن میں وسوسہ ڈال دیا جو اس مکان کو، گلی کو، بلکہ پورے محلے کو چہل پہل اور آوازوں سے معمور رکھتی تھی۔ میں سیڑھیاں دوبارہ چڑھ کر اوپر گیا اور اُس کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی۔ مگر کسی نے میری دستک کا جواب نہ دیا۔ میں نے بند دروازے میں سے اندر کا پتہ چلانے کی کوشش کی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں نے کنجی کے سوراخ سے آنکھ لگا کر جھانکا، کچھ نظر نہ آیا۔ کان لگا کر سنا، کوئی آواز سنائی نہ دی۔ صرف میری ناک کو ایک بُو محسوس ہو رہی تھی جو جرم کے قریب قریب پہنچتی تھی۔ میں نے فوراً پولیس اسٹیشن جا کر اپنے خدشوں کی اطلاع دینے کا فیصلہ کیا، کیوں کہ چند ہفتے قبل شیخ مدیحہ کے منتقی ہو جانے سے پہلے، ایک سے زیادہ رشتوں نے ہمیں ایک دوسرے سے باندھ رکھا تھا۔

جب میں نے اُسے بتایا کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور نہ کہ ایسی بات کا الزام اٹھانے کی کیا ضرورت ہے جس کے سلسلے میں ہم بے قصور ہیں، تو وہ جواب میں ہنسنے لگی، جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ابھی میں پڑھ رہا ہوں۔"

"اور بیوی کا خرچ نہیں اٹھا سکتے؟"

"میں نے ابھی دلہن کا انتخاب بھی تو نہیں کیا۔"

"دلہن تمھارے سامنے ہے، رقم کا کوئی مسئلہ نہیں، مکان سجا سجایا موجود ہے۔"

اس طرح اس نے میرے شادی کی تجویز پیش کی، لیکن ایسی ہنسی سے، اس جواب سے لوگوں کی زبانیں بند ہو جائیں گی، یہ بات جو شیطان کے دماغ میں بھی نہ آتی، خفیہ ملاقاتوں کی توضیح کر دے گی اور میرے خوف کا خاتمہ ہو جائے گا۔ مجھے نیچے چھت والے کمرے سے اتر کر اُس کے فلیٹ میں جانا تھا، لوگوں کے سامنے اس کی بیٹی کے شوہر کی حیثیت سے، اور شیطان کے سامنے اُس کے عاشق کے طور پر۔ کیسا گناہ آلود منصوبہ تھا! اور ہمارے اس منصوبے کی شکار کسی بدقسمت تھی! کیسی دیوانی عورت تھی

جس نے مجھے اور اپنی بیٹی کو اپنی ترنگ کی بھینٹ چڑھا دیا؟ وہاں میں تو میں ایک تیر سے دو شکار کر کے خوش خوش، اب مستقبل ترانہ وضع کرتا ہوں؛ میں خوف زدہ ہوں، اس لیے موجود ہوں۔

تھانے سے واپس آتے ہوئے میرے دل میں کچھ کچھ امید تھی کہ شاید میرے خدشے محض خیالی ہوں اور شاید مجھے دروازہ کھلا ہوا ملے اور شبیحہ مدیحہ دروازے میں کھڑی ہو کر پولیس کا راستہ روک دے، کیوں کہ اگر شبیحہ مدیحہ کو کچھ ہو گیا تو یہ میرے لیے نہ ختم ہونے والی مصیبتوں کا آغاز ہو گا اور سب سے پہلے مجھی پر الزام رکھا جائے گا۔ جب مجھ سے تفتیشی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونے کو کہا گیا تو میں خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں نے اپنے اور شبیحہ مدیحہ کے تعلقات کا خلاصہ پیش کیا اور اس کے ساتھ کسی گناہ آلود ربط سے انکار کیا اور ایسے خیال تک سے بیزاری ظاہر کی؛ بعض شرارتی گواہوں نے مجسٹریٹ کو اس قسم کے امکانات سے آگاہ کیا تھا۔ میں نے تسلیم کیا کہ جمعرات کی صبح میں نے اُسے اس کا قرض لوٹایا تھا۔

"کیسا قرض؟"

"وہ رقم جو اُس کی بیٹی سے اپنی شادی کے دن میں نے اُس سے اُدھار لی تھی۔"

"تم نے کتنی رقم لوٹائی؟"

"دو پونڈ۔ پہلی قسط۔"

جہاں تک اپنے اور اُس کے جھگڑے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں میں نے ایک لفظ نہیں کہا۔ اس کی بیٹی کی چپّل کا ٹکڑا، پھیکے پڑتے ہوئے سرخ رنگ کا، ہمارے سامنے میز پر پڑا تھا۔ اچانک اس نے مجھ سے چپل کے باقی حصے کے بارے میں سوال کیا؛ میں نے اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ اگر مجھ پر دباؤ ڈالا جاتا تو میں فوراً اعتراف کر لیتا، کیوں کہ میں جھوٹ بولنے میں ماہر نہیں ہوں؛ یہ میری کمزوریوں میں سے ایک ہے، جو کچھ میری زبان چھپاتی ہے، میرا اضطراب ظاہر کر دیتا ہے۔

جس بات کا مجھے دھڑکا تھا وہی ہوئی۔ دروازہ پہلے کی طرح بند تھا اور پڑوسی، مرد اور عورتیں، جمع تھے اور بدبو سے واقعے کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب پولیس دروازہ توڑ کر اندر گھسی تو انھوں نے شبیحہ مدیحہ کو بستر پر مُردہ پایا؛ اس کی لاش سے ناک میں چڑھ جانے والا

تعفّن اٹھ رہا تھا۔ میرا دل ڈوب گیا، گھٹنے کانپنے لگے اور مجھے چکر آ گیا۔ خود کو سنبھالنے پر مجھے معلوم ہوا کہ ہر شخص نے اپنے رومال یا ہاتھ سے اپنی ناک بند کر رکھی ہے؛ میں نے بھی ایسا ہی کیا اور جو سوال سب لوگ کر رہے تھے وہی میں بھی کرنے لگا: کیا اس کا مطلب ہے کہ کوئی جرم ہوا ہے؟ اور اگر ہوا ہے تو ملزم اور گواہ کون ہیں، اور کیا میرا نام بھی ملزم یا گواہ کے طور پر آ سکتا ہے؟ اور اگر میں ملزم ہوں تو مجھ پر قطعی طور پر کیا الزام ہے؟ کیا بالآخر میں مجرم ثابت ہوں گا؟

پچھلی گرمیوں میں، اپنی تعلیم کا چوتھا اور آخری سال شروع ہونے پر، اپنے رہنے کے لیے ایک کمرے کی تلاش میں میری ملاقات ایک دلال سے ہوئی۔ پہلا سال میں نے قاہرہ کے شوروشغب میں آوارہ گردی کرتے ہوئے گزارا تھا؛ میں اپنے عم زاد کے ساتھ رہتا تھا اور اپنے باپ کی نصیحتیں، ماں کی دعائیں اور کھانے پینے کی چیزیں جو انھوں نے میرے بہن بھائیوں کے حصے میں سے مجھے دی تھیں، گرہ میں باندھے، اس بڑے شہر کی پیچ دار گلیوں میں بھٹکتے ہوئے اس کے اسرار سے واقف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرا لہجہ اور لفظوں کا تلفّظ میرے ہم جماعت لڑکوں اور لڑکیوں پر میری اصل کو ظاہر کر دے گا۔ یہ دیکھ کر مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ یہ لڑکے اور لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ کھلےعام اور بے روک ٹوک گھومتے پھرتے ہیں؛ اور مجھے بھی ایسا ہی کرنے کی خواہش ہوئی۔ لیکن مجھ میں دو چیزوں کی کمی تھی: ایک تو اُس صلاحیت یا مہارت کی جو اس کے لیے درکار تھی، اور دوسرے رقم کی۔ اس لیے میں تنہا ہی رہا اور لوگوں سے کترانے لگا۔

پچھلی گرمیوں میں میرے عم زاد کی شادی ہوئی۔ گاؤں سے واپس آنے پر میں نے اُس کے فلیٹ کو خوش وضع چمکیلے فرنیچر سے آراستہ اور اُس کی حسین بیوی کے قبضے میں پایا۔ میرا بستر، کرسی، میز، اور کتابیں اُس نے فلیٹ کے ایک اوجھل کونے میں ڈھیر کر دی تھیں۔ سو میں سر چھپانے کی جگہ کی تلاش میں نکل گیا اور بالآخر اپنے اس کمرے تک پہنچا۔

پچھلی گرمیوں میں مجھے پتا چلا کہ میں اس فرونٹ عمارت کی عورتوں کو جب وہ اپنے اور اپنے شوہروں اور بچّوں کے کپڑے پھیلاتے چھت پر آتی، اپنے دروازے کی جھری میں سے جھانک کر دیکھ سکتا ہوں۔ ہر جمعے کی صبح کو مدیحہ اپنے کپڑے پھیلانے آتی۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس کے کپڑوں میں مردوں اور بچوں کے لباس نہیں ہوتے، صرف زنانہ کپڑے ہوتے ہیں۔ یہ دوسرا موقع تھا جب میری اُس سے ملاقات ہوئی؛ پہلی بار میں اُس سے اس کے فلیٹ میں اُس دن ملا تھا جب میں نے کمرہ کرائے پر لیا تھا۔ اُس دن میں نے نوٹ کیا تھا کہ اس کی عمر چالیس کے لگ بھگ ہو گی اور اُس کی بیٹی، جو اس کے ساتھ تھی، کم و بیش بیس سال کی ہو گی۔ مگر جب وہ مجھ سے اپنے کچھ کپڑوں کے بارے میں دریافت کرنے آئی جو گم ہو گئے تھے، تو وہ مجھے بیس سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوئی۔ وہ چونگ گم چبا رہی تھی اور اس نے مجھے خوشبودار اور سرایت کر جانے والی مہک کے نرغے میں لے لیا۔ اُس کا لباس سادہ مگر جگمگاتے ہوئے رنگوں کا تھا اور اس سے نہ حیا کی نمود کا اظہار ہوتا تھا اور نہ اُس وقت تک اس کے فقدان کا۔ اس نے گنے چنے لفظوں میں اپنی بات کہی جو بیباکی سے مگر شائستگی کے ساتھ ادا کیے گئے تھے۔ پھر بھی مجھے اُس میں اپنے لیے ایک چھپی ہوئی دعوت کی موجودگی کا احساس ہوا جو اُس کی خوشبو، اس کی چونگ گم، اس کے لباس اور اس کی شائستہ بیباکی سے پھوٹ رہی تھی۔ رات میں، نیند اور بیداری کے درمیان، میں نے اُسے اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھا، جب کہ میری ہم سن لڑکیاں جنہیں رات کو آنکھ لگے ہی دیکھنے کی مجھے عادت ہو گئی تھی، نظر سے اوجھل ہو چکی تھیں۔

دوسرے موقعے پر، جب اُس کی بیٹی ریبیکا سوکھے ہوئے کپڑے اکٹھے کر رہی تھی میں دیر تک سامنے کھڑا رہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تکلیف ہے اور میں نے کہا کہ کچھ نہیں، اگرچہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ مجھے کیا تکلیف ہے یا مجھے کیا چیز درکار ہے۔ سب سے پہلے گاؤں اور ضلعی صدرمقام میں اور پھر کالج میں اپنے ہم سبق لڑکے لڑکیوں کے ساتھ میرے تجربات نے مجھے لوگوں سے ڈرنا اور دہشت زدہ ہونا سکھا دیا تھا؛ پھر بھی میں کچھ نہیں سیکھا۔ لوگوں کے لیے میری طلب مجھے اُن سے دور لے جاتی ہے۔

ریبیکا میں نہ اپنی ماں کی سی شکستگی تھی اور نہ کشش، حالانکہ

نوعمری نے اس میں دھیمی سی ملاحت ضرور پیدا کر دی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ گھر سے مختلف وقتوں میں باہر جاتی اور واپس آتی تھی؛ کبھی دوپہر کو، کبھی شام کے وقت، اور کبھی کبھی تو وہ رات میں باہر جاتی اور صبح سے پہلے نہ لوٹتی، جس کی میں کوئی توضیح نہ ڈھونڈ سکا۔ بہرحال، بعد میں مجھے پتا چلا کہ وہ ایک ہسپتال میں نرس کے طور پر ملازم ہے۔ اس کی ماں نے بےپروائی سے کہا، "مجھے اس کے بارے میں کوئی دھڑکا نہیں، نہ بیماروں سے نہ تندرستوں سے، چاہے وہ ڈاکٹر ہوں یا اسپتال کے عملے کے لوگ، کیوں کہ وہ اپنے مرحوم باپ کی طرح جذباتی طور پر بہت پُرسکون ہے، یعنی ٹھنڈی اور ٹھس ہے۔ کیا تم تصوّر کر سکتے ہو کہ لڑکپن کے دن اس نے یوں گزارے جیسے برف کا تودہ ہو؟ اس کا شوہر بغیر کسی نگرانی یا حرج کے اس کی عفّت کی طرف سے مطمئن رہ سکتا ہے۔ ہا ہ ہا! زینب اپنی شکل صورت اور طبیعت میں اپنے مرحوم باپ پر گئی ہے۔ وہ دس سال پہلے مرا تھا اور جائیداد اور دنیا میں میرے حصے کے طور پر یہ لڑکی اور یہ مکان چھوڑ گیا تھا۔"

لڑکی کا لیے دیے رہنے کا انداز مجھے ماں کے خوش باش اور آزاد طرزِعمل پر ایک خاموش احتجاج معلوم ہوتا تھا، مگر اس کے باوجود اپنی ماں کی برائی میں ایک لفظ سن کر اس کے اندر کا سدھا ہوا جاندار کسی وحشی جانور میں بدل جاتا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کی آواز کو اس وقت بلند ہوتے ہوئے سنا جب وہ ایک کرائےدار عورت پر چلّا رہی تھی اور میں سیڑھیاں چڑھ کر اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا، اور میں نے جو کچھ دیکھا اور سنا اس پر مجھے اعتبار نہ آیا -- وہ میرے حق میں بول رہی تھی۔ میں نے پہلی بار اس کے منھ سے اپنا نام سنا، اور یہ نام مجھے اپنا بھی لگ رہا تھا اور اجنبی بھی: موجود عبدالموجود۔

پھر باتیں سننے لگی۔ شاید یہ کسی ہونے والی بات کی پیش گوئی ہے، کیوں کہ ابھی جس چیز کا شبہ ہے وہ اب تک تو پیش نہیں آئی -- اور مجھے یقین ہے آئے گی بھی نہیں۔ بہرحال اس کی مجھے توقع تھی اور خوف بھی تھا:

میری نوعمر درست شکلی جس بات کی مجھے خدشہ تھا وہ ہو کر رہی۔ میں نے اسے خبردار بھی کیا تھا مگر اس نے میری بات پر کچھ دھیان نہیں دیا۔ اس کی بے خوفی سے مجھے ڈر بھی لگتا ہے اور کشش بھی محسوس ہوتی ہے، وہ مجھے دور بھی کرتی ہے اور اپنی طرف کھینچتی بھی ہے۔ لوگوں کی نظروں میں ایسا الزام تھا جس کی سند بھی تھی اور تہمت بھی تھی۔ وہ مجھ سے میرے کمرے میں ملنے آئی تھی۔ اس کا یہ فعل یقیناً غیرارادی تھا، مگر میں جانتا تھا کہ یہ دیکھنے کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ فجر کا وقت تھا سیٹی کے چھت پر آنے سے پہلے کا وقت۔ مگر میں خود کو بری الذمہ کرنے کی کوشش کیوں کر رہا ہوں، جیسے میرا پیچھا کر کے مجھے گھیر لیا گیا ہو اور خود میں نے، اس سے بڑھ کر رازدارانہ اور لطیف انداز میں کوشش نہ کی ہو؟ میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے پہل کی تھی اور پوچھا تھا کہ گاؤں سے میرے نام کوئی خط تو نہیں آیا، لیکن پھر اس کی جگہ ریسٹ کو دیکھ تھا؟ اس نے مختصر جواب دیا تھا کہ کوئی خط نہیں آیا۔ بہرحال، جب مہینے کی پہلی تاریخ آئی تو میں نے پھر حملہ کیا اور کرایہ ادا نہیں کیا، کیونکہ پیسے نہیں بھیجے تھے، لیکن میں نے اس سے کرایہ ادا نہ کرنے کی معذرت کی اور اس دوران اس کی جانب سے دعوت کا خواہش مند اور اس سے خوف زدہ رہا۔ مجھے خوف تھا کہ نہ جانے یہ دعوت کون سی اور دعوتوں کی تمہید ثابت ہو، اور ایسی دعوت سے کیسی چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں۔ جب میں نے اسے اشارتاً بتایا کہ لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ایسی بات کا الزام اٹھانے سے کچھ حاصل نہیں جس کے سلسلے میں ہم بےقصور ہیں تو وہ جواب میں ہنس پڑی جیسے میں نے اسے کوئی لطیفہ سنایا ہو۔

عورت نہ جانے کسی دہلا دینے والی چیز ہے! میں ایک دیہاتی طالب علم ہوں جو قصبے کے اسکول کی پہلی جماعت میں پہلی بار داخل ہو رہا ہے؛ میں دور کسی چھوٹی سی جگہ سے آنے والا طالب علم ہوں جو قاہرہ یونیورسٹی میں اپنے پہلے دن کے پہلے لمحے کا سامنا کر رہا ہے۔ مجھے دل کڑا کر کے اور الگ تھلگ رہنا چاہیے؛ مجھے سیکھنا اور خود کو عادی بنانا ہے؛ مجھے کوئی چیز حاصل کرنی ہے اور کچھ چیزیں مجھ سے پوشیدہ رہنی چاہییں۔ میری انانیت باصلاحیت اور تجربہ کار ہے اور خود کو ڈرپوک جنگلی جانور سے ہم آہنگ کر لیتی ہے۔ مجھے دروازے پر دستک سنائی دیتی اور

ہمارا لطف خاک میں مل جاتا، پھر مجھے پتا چلتا کہ یہ صرف ہوا تھی اور ہم ٹوٹے ہوئے سلسلے کو دوبارہ جوڑنے، میں جادوئی غاروں میں اترتا چلا جاتا اور اپنے خوف کو خوف کے منبعے میں چھپا لیتا۔

مکان کے سامنے ایک کھلا احاطہ ہے؛ احاطے میں کسی بزرگ کا عُرس ہو رہا ہے۔ قریب میں سو ہزار لوگ شریک ہیں، ہر ایک کے سو ہزار ہاتھ ہیں، ہر ہاتھ میں ستر ہزار چپّلیں ہیں، ہر چپّل میں سو ہزار شمعیں جل رہی ہیں۔ وہ جھومتے ہوئے گنگناتے ہیں: "جو جائز نہیں تھا وہ ہو گیا قسمت کا لکھا سامنے آیا۔ بےشک تو رحمن اور رحیم ہے۔"

شادی کے دن میری کتابیں چھت والے کمرے سے دلھن کے کمرے میں منتقل ہو گئیں، جبکہ میرا دوہرے استعمال والا فرنیچر اپنی جگہ پر رہا۔ میں نے اپنی دلھن کو چند معمولی تحفے دیے؛ خوشبو کی ایک بوتل، کپڑوں کا ایک جوڑا اور سرخ مخمل کی چپّلیں۔ چپّلیں ان میں سب سے کم قیمت تھیں، اور حیرت کی بات ہے کہ انہیں کو سب سے زیادہ پسند کیا گیا۔ اس نے انہیں سینے سے لگایا اور چوما، اور اب، اے میری دلھن، میں جانتا ہوں کہ تیری یہ مسرّت کس بدبختی کی پیش گوئی کر رہی تھی۔ جہاں تک میرے باپ کا تعلّق ہے، میں نے ڈر کے مارے اسے اطلاع نہیں دی۔

کمرے کا ایک دروازہ تھا، دروازے میں ایک سوراخ تھا اور سوراخ کی ایک کنجی تھی۔ وہ اتنی محتاط تھی کہ کمرے میں داخل ہو کر تالا لگ جاتی، اور میں اس سے بھی زیادہ محتاط تھا کہ کنجی کو سوراخ میں اٹکا رہنے دیتا، تاکہ سوراخ بھی بند رہے اور اگر زینب اندر جھانکنا چاہے تو اس کی آنکھ پر بھی پردہ پڑا رہے۔ لوگوں کی نظروں سے پناہ کہاں ہے؟ ہم نے اجنبیوں کی آنکھیں بند کیں تو زینب کی آنکھیں کھل گئیں۔

زینب کی عادت تھی کہ اپنے کام کے سلسلے میں جہاں کہیں جاتی مکان کی دوسری کنجی اپنے ساتھ رکھتی۔ شادی کے بعد بھی اس کا یہ معمول جاری رہا، تاکہ کہیں ہم اس کے شبہات کو بیدار نہ کر بیٹھیں، کیونکہ لوگوں کی سرگوشیاں اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ کنجی، مکان کے باہر کے

دروازے کی کنجی، اس کے پاس رہنے دینا ہماری پہلی دفاعی سمت تھی۔ کسی کمرے کے دروازے کی کنجی سوراخ میں اٹکی رہنے دینا ہماری دوسری دفاعی سمت تھی۔ ان دونوں دفاعی تدبیروں کی کمزوریاں ظاہر ہیں: پہلی تدبیر میں کوئی شخص چپکے سے پاس پہنچ سکتا ہے، دوسری تدبیر میں رنگے ہاتھوں پکڑ سکتا ہے۔

چپّل کمرے کے دروازے پر پڑی ہوئی ملی، جس وقت نیچے گلی سے عورتوں کے بین کرنے اور بچّوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ محرمانہ مسرت اور دہشت گلے میں جھنجھنا رہی تھی۔ یعنی اُس نے اپنے کانوں کے ذریعے سے کمرے کا پردہ چاک کر لیا تھا، جو کچھ اس کی آنکھوں سے چھپا ہوا تھا اس نے اپنے کانوں سے دیکھ لیا تھا۔ تفتیش کے دوران پتا چلا کہ زینب دیوار پر سے، چھت کی دیوار پر سے، جہاں میرا کمرہ تھا، نیچے کود گئی تھی۔ وہ ننگے پاؤں پڑی تھی، اس کی آنکھیں، ہول اور اتنی اونچائی سے گرنے کی وجہ سے، اُبلی ہوئی تھیں۔

چپّلوں کا راز میرے اور مدیحہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ میں نے انھیں اپنی دلہن کے پیروں میں پہنانا چاہا، جس وقت وہ لاش میں تبدیل ہو چکی تھی اور ہم اسے قبر کے سپرد کر رہے تھے، لیکن اُس کی ماں نے انھیں اپنے پاس رکھنے پر اصرار کیا۔ جب بین کرنے والی عورتیں آئیں تو انھوں نے اسے چپّلوں کو سینے سے لگاتے اور چومتے ہوئے پایا۔

اس کے اگلے دن اس نے مجھے اپنے فلیٹ سے نکال دیا۔ میرا ارادہ بھی یہی تھا کہ اس کے کہنے سے پہلے ہی اپنے چھت والے کمرے کو لوٹ جاؤں۔ مجھے اس کی سختی نے ڈرا دیا، اس کی تکرار نے حیران کر دیا۔

"تمھاری بیوی مر چکی ہے اور تمھارا میرے فلیٹ میں رہنا شرعاً ناقابلِ قبول ہے۔"

مجھے ہچکچاتا دیکھ کر وہ چلّانے لگی:

"خاموشی سے چلے جاؤ ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گی۔"

جس طرح خوف مجھے نیچے لایا تھا، اسی طرح خوف مجھے واپس اوپر لے گیا۔

میں ایک ایک کر کے اپنے کاغذ پھاڑنے کی عادت میں مبتلا ہو گیا،

Scanned with CamScanner

میرے باپ کے خط، مرحومہ زینب اور اس کی ماں مدیحہ کی تصویریں، میرے مدرسین کے نوٹس؛ یہاں تک کہ میں نے اپنی اسکول کی کتابیں اور وہ نوٹ بکیں بھی تلف کر ڈالیں جن پر میں طالب علموں کو دینے کے لیے اپنے لیکچر تیار کرتا تھا، کہ کہیں ان میں کوئی ایسی چیز نہ نکل آئے جو، میری بےخبری میں، مجھے مجرم ثابت کر دے۔

عُرس کی راتوں کو مدیحہ بال بکھرائے، ننگے پیر، پھٹاپرانا جلّابیہ پہنے باہر نکل جاتی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں میں ایک ایک چپّل لے لیتی، ہر چپّل پر ایک شمع رکھتی اور ہر شمع پر ایک شعلہ روشن کر لیتی۔ اس کے منھ سے الفاظ ادا ہوتے، نہ تو سرگوشی کی طرح دھیمے اور نہ چیخ کی طرح بلند: "ہم سے گناہ سرزد ہوا، اور بےشک تیری آنکھ نیند سے بیدار ہے۔ سو اے انسانوں کے رب، تیرا انتقام بہت سخت ہے۔" پھر وہ چلّاتی: "میں نے تمھیں دیکھ لیا... میں نے تمھیں پکڑ لیا... تم دونوں کو..."

وضاحت کے لبوں پر ابہام راز بدنامی کی شکل اختیار کرنے کو ہے۔ اس نے جتنا فاصلہ گلی میں طے کیا، اُتنی ہی مکان کی بندی بھی؛ ایک قدم آگے اور ایک قدم پیچھے۔ جب عرس کا شوروشغب تھما تب بھی مدیحہ گلیوں میں بھٹکتی پھری۔ اس کے سر پر ایک خوان تھا، خوان میں دونوں چپّلیں رکھی تھیں، دونوں چپّلوں میں دو شمعیں تھیں، اور دونوں شمعوں کے سروں پر دو شعلے تھے۔ لوگ دو گروہوں میں بٹ گئے: ایک گروہ وہ تھا جو اسے حیرت اور تحسین سے دیکھتا، اور دوسرا وہ جو مجھے دیکھ کر -- اور مجھے دیکھے بغیر -- افواہیں ایجاد کرتا اور آپس میں سرگوشیاں کرتا۔

میرا خوف اب دونوں چپّلوں پر، ان کے سرخ رنگ پر، ان کے مخملی لمس پر، اور ان میں بسے رہنے والے تلووں اور انگلیوں کی بُو پر مرکوز ہو گیا تھا۔ نیند میں میں انھیں حرکت کرتے دیکھتا، جیسے کسی شخص نے انھیں پہن رکھا ہو، اور وہ کمرے کی دیواروں پر آزادی سے چلتی پھرتیں جب چھت پر پہنچتیں تو گر کر میرے سر پر آ پڑتیں، اور میں خوف سے چونک کر انھیں جھٹک دیتا، جس پر وہ اپنا سفر پھر سے شروع کر دیتیں۔ میری آنکھ کھل جاتی اور مجھے معلوم ہوتا کہ میرا مثانہ دباؤ سے پھٹ رہا ہے۔

اگر میں اُس سے انھیں چھین لیتا تو گویا اُس پاگل عورت سے اپنا راز چھین کر اپنے قبضے میں کر لیتا جس کے لفظ ہر روز اپنے ڈھکے چھپے انکشاف سے مجھے دہلاتے رہتے تھے۔ کئی بار میں نے ٹھانی کہ جب ہم گرمیوں میں گلی کے دھندلکے میں یا جاڑوں میں اس کی پھسلواں کیچڑ میں آمنے سامنے ہوں تو میں اس پر حملہ کر کے انھیں اس سے چھین لوں، مگر مجھے اپنے خوف سے خوف آنے لگتا کہ جو اب تک مبہم ہے واضح ہو جائے گا اور راز کھل جائے گا۔ اگر وہ انھیں ایک لمحے کے لیے بھی اپنے فلیٹ میں چھوڑ دیتی تو میں دبے پاؤں جا کر انھیں چرا لاتا، لیکن وہ انھیں ساتھ لے کر گھر سے نکلتی تھی اور ان کے ساتھ ہی واپس آتی تھی۔

ایک شام میں نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کی آواز سرسراہٹ میں بدل گئی: "بہانے کی جرأت نہ کرنا۔ میں جانتی ہوں تم کیوں آئے ہو۔"

یہ کہہ کر وہ سامنے والے کمرے میں رکھے صوفے کی طرف لپکی جہاں چٹھیاں رکھی تھیں؛ انھیں اٹھا کر اس نے سینے سے بھینچ لیا، اور میں نے خود کو پرسکون ظاہر کر کے اسے پُرسکون کرنے کے لیے جواب میں کہا:

"میں جائیداد میں اپنے حصے سے دست برداری کا اعلان کرنے آیا ہوں۔"

"جھوٹ بولتے ہو۔"

"اور یہ بتانے کہ میں نے ایک اور کمرہ دیکھ لیا ہے۔"

ایک لمحے کو وہ ساکت سی ہوگئی، پھر چٹھیوں کو لہراتے ہوئے بولی:

"تم خدا کی نظروں سے نہیں بچ سکتے۔"

اس نے چٹھیوں کو پھر سینے سے لگا لیا، اور احتیاط رکھی کہ میرا اور اُس کا فاصلہ کم نہ ہونے پائے اور میں غور سے جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات کہتا رہا:

"اور میں تمھارا قرض بھی چکانا چاہتا ہوں۔"

"تم پر بہت سے قرض ہیں۔ تم دیوالیہ ہو۔"

میں نے اپنا ہاتھ پھیلایا جس میں رقم تھی اور اس نے رقم لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا، مگر دوسرے ہاتھ سے چٹھیوں کو مضبوطی سے تھامے رکھا۔ یہی موقع تھا۔ یہ چٹھیاں میرا راز تھیں اور میری دشمن، میرا خوف اور میری

مشوش؛ انھیں میں نے ہی خریدا تھا، میں نے ہی تحفے میں دیا تھا؛ اس لیے وہ مجھ سے تعلق رکھتی تھیں اور میری ملکیت تھیں۔ تو پھر کوئی اور شخص مجھے دھمکانے اور میرا راز افشا کرنے کے لیے انھیں قبضے میں کیوں لیے ہوئے تھا؟ اس نے میرے سینے پر ایک ہاتھ رکھ کر مجھے زور سے دھکا دیا، اور دوسرے ہاتھ سے انھیں اپنی وحشی گرفت میں رکھا۔ کئی بار میں نے ان ہاتھوں کو، ان نرم اور نازک ہاتھوں کو، چوما تھا، اور اب ان میں سے ایک اپنے بچّے کو بچاتی ہوئی شیرنی کا پنجہ بن گیا تھا اور دوسرے کی پشت پر ابھری ہوئی رگوں کو میں اپنی آنکھ کے بالکل پاس یوں دیکھ رہا تھا جیسے خوردبین میں سے دیکھ رہا ہوں؛ وہ میرے منھ کے اتنے قریب تھا کہ مجھے اس کو کاٹ لینے، بلکہ چبا جانے کی ترغیب محسوس ہوئی۔ پھر بھی لگتا تھا کہ اس کی عزیز متاع کو چھیننا صرف ہاتھوں کی زورآزمائی سے ممکن نہیں ہو گا، خاص طور پر اس لیے کہ اس کی چیخیں میرے منصوبے کو خاک میں ملانے کو تھیں۔ سر پر ضرب لگاؤ تو ہاتھ ڈھیلے پڑ جاتے ہیں۔ کیا ایک سیکنڈ گزر گیا؟ دو سیکنڈ؟ چپلیں میرے ہاتھ میں تھیں؛ میرا راز میرے قبضے میں تھا۔ میں نے باہر نکلتے ہوئے دروازے کو قفل لگا دیا اور لپک کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے کسی نے نہیں دیکھا، نہ زینے میں اور نہ چھت پر۔ وہ منحوس چپلیں اب میرے سامنے تھیں؛ میں نے انھیں غور سے دیکھ کر خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔ مجھ پر انکشاف ہوا ــ اور وہ کیسا ہولناک انکشاف تھا! ــ کہ وہ سالم میرے قبضے میں نہیں آئی تھیں، کہ ان کا ایک ٹکڑا، یعنی داہنے پاؤں کی ایڑی کے اوپر کا پچھلا حصہ، کچھ ہی دیر پہلے سفاکی سے نوچ لیا گیا تھا۔ بلاشبہ، میں جانے بغیر، خوف اور مسرت کی کیفیت میں، یہی شے کو مکمل اور اسے اپنے خلاف اس کے ہتھیار سے محروم سمجھتے ہوئے، اس کے قبضے سے لپک کر باہر نکلتے ہوئے اس ٹکڑے کو اس کی مٹھی میں دبا چھوڑ آیا تھا۔ جب کہ وہ بےہوشی کی حالت میں بھی اس شے کے ایک حصے پر قابض تھی جسے میں اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔

بیماری کے دوران دونوں سرخ چپلیں دوبارہ ظاہر ہو کر میرے کمرے کی دیواروں پر میرا پیچھا کرنے لگیں، ایک بار صبح سویرے اور دوسری بار

شام ہونے سے پہلے۔ اگرچہ دونوں وقت وہ مجھے اپنی صاف نظر آتی کہ داہنے پیر کی ایڑی کے اوپر کا حصہ بالکل اُسی طرح اکھڑا ہوا دکھائی دیتا جیسا اصل میں تھا، اس کے باوجود مجھے احساس ہوتا کہ یہ بخار کا نتیجہ ہے، محض واہمہ ہے اور یہ کہ مجھے اپنے کمرے کی حتمی شہادت پر، اس کی دیواروں، اس کے اینٹوں کے فرش، اس کی چھت، اس میں رکھے ہوئے صوفے، کرسی، میز اور پلنگ کی شہادت پر بھروسا کرنا چاہیے۔ مجھے خوف تھا کہ میں اس دنیا سے رابطہ کھو بیٹھوں گا اور پھر مجھے یہاں تک واپسی کا راستا نہیں ملے گا۔

اُس روز مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں نے خود کو خوف میں مبتلا کرنے والے عزیزوں کی بابت خوف زدہ ہونے کے لیے سرطان کی بیماری کا انتخاب کیا ہے۔ اس انتخاب کی وجہ اس بیماری کی خصوصیات تھیں۔ یہ تقریباً واحد مرض ہے جس کا سبب یا علاج دریافت کرنے میں علم طب اب تک ناکام ہے۔ یہ ہر عمر کے لوگوں پر حملہ کرتا ہے، بدن پر کسی بھی جگہ چھپ کر بیٹھ جاتا ہے، اور ذرا سا درد، یا درد کے بغیر کوئی ذرا سی بے سکونی اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ یہ زہریلا مرض پوری طرح اپنے پنجے گاڑ چکا ہے۔ اس کا درد بھی، اکثر صورتوں میں، انتہائی خوفناک اور سخت ہوتا ہے۔

اُس روز میری تنہائی کا احساس کئی گنا بڑھ گیا۔ اُس روز مجھ پر دو انکشاف ہوئے، پہلا یہ کہ مجھے موت سے خوف نہیں آتا اور دوسرا یہ کہ موت سے نہ ڈرنے کا مطلب اُن چیزوں سے نہ ڈرنا نہیں جو موت سے پہلے آتی ہیں جیسا کہ میں سمجھتا تھا۔ میرا خوف، درد اور شکستگی کا، اور اپنی توقیر کے برباد ہو جانے کا خوف کئی گنا بڑھ گیا۔ وہ دن میری صحت یابی کا آغاز تھا۔ سوائے اس کے کہ بیماری کا آسیب مجھے اب بھی دہشت زدہ رکھتا ہے اور اس کی جو بات مجھے دہشت زدہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ مجھے واہموں اور پراگندہ خیالوں کی دنیا میں لے جائے گی۔

اُس روز مجھے معلوم ہوا کہ میرا خوف میری زندگی کے تمام پہلوؤں تک پھیل چکا ہے۔ کوئی مرض مجھے اپاہج کر دے گا، موت میری ماں یا میرے باپ کو اٹھا لے گی، میرا ہیڈماسٹر یا انسپکٹر میرے بارے میں خراب رپورٹ لکھ دے گا۔

صحت یابی کے آغاز پر مجھے معلوم ہوا کہ میرے خدشوں کی دنیا میں

واپسی حقیقت پر حاوی ہو جاتا ہے میں بیمار تھا اور صحت یاب ہو گیا ہوں؛ میرا باپ گاؤں میں ایک خوبی انعام کا ہدف سے والا تھا اور بچ گیا؛ میرے ہیڈماسٹر یا انسپکٹر نے میرے ساتھ زیادتی نہیں کی؛ اور چونکہ تفتیشی میجسٹریٹ نے مجھے بہت پہلے بری کر دیا تھا، کسی شخص کو مجھ پر کوئی شبہ نہیں ہوا، اور اس کے بعد کسی میجسٹریٹ نے مجھے حراست میں لے کر تفتیش نہیں کی۔ اس لیے مجھے چاہیے کہ اپنے خوف کو اتار پھینکوں اور اعتماد اور سکون سے آگے بڑھوں۔ اُس روز میں نے اپنے ایک مدرّس ساتھی کے گھر جانے اور رات کا کھانا شہر کے ایک پُرتعیّش ریستوران میں کھانے کا ارادہ کیا۔ اپنے کمرے میں واپسی پر میں نے کھڑکیاں کھول دیں اور دروازے کے سوراخ میں سے کنجی نکال کر، کئی برسوں میں پہلی بار کسی بےحوابی یا اضطراب کے بغیر گہری نیند سویا اور چاندنی اور رات کی نرم ہوا آہستگی سے مجھے مَس کرتی رہی۔

لیکن صحت یابی کے آثار کے ایک ہفتے بعد مجھے ایک تار موصول ہوا جس میں میرے باپ کی ناگہانی اور غیرمتوقع موت کی خبر تھی۔ اُس لمحے میں پچھتاوے کے گہرے احساس میں ڈوب گیا؛ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا خوف میرے باپ کی حفاظت کرتا رہا تھا، اور میں نے اپنے سکون کو ترجیح دے کر اسے اس کی حفاظت سے ہٹا لیا تھا اور یوں موت کو ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ مجھ پر جھپٹ کر میرے باپ کو مجھ سے چھین لے جائے۔ اس طرح مجھے اپنے سکون سے ہونے کی سزا ملی، اور اُس روز میں نے جانا کہ میرے خوف کا صلہ یہی ہے کہ مجھے جس جس چیز کا خوف ہے وہ پیش نہ آئے -- اور اگر پیش بھی آئے تو اس کا اثر تصوّرات اور واہموں کے ہاتھوں بڑی حد تک کم ہو چکا ہو۔

اُس روز سے لے کر، جب کبھی میں سکون سے ہوتا تو خوف میں مبتلا ہو جاتا، اور جب خوف میں ہوتا تو مجھے سکون ہوتا، اور جب کبھی سکون سے ہوتا تو کسی بدبختی کی توقع کرنے لگتا، اور جب خوف میں ہوتا تو خود کو محفوظ خیال کرتا۔ اُس روز سے لے کر جب کبھی میں نے خود کو کسی تردّد میں گرفتار نہیں پایا تو تردد میں مبتلا ہو گیا۔

جب میں نے اُس کے سر پر ضرب لگائی تھی تو وہ کمرے کے وسط میں

گر پڑی تھی۔ جب میں پولیس کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا تو اس کا مسخ شدہ بدن صوفے پر گٹھڑی سا ہوا پڑا تھا۔ جو رقعہ اُس نے مجھ سے جمعرات کی دوپہر وصول کی تھی وہ نہ اُس کی مٹھی میں تھی اور نہ کہیں فرش پر۔ چند دن بعد میں معائنے کی رپورٹ آئی جس میں تھا کہ موت جمعے کی صبح کو واقع ہوئی۔ اُس دن سے لے کر میں فرش کے وسط سے صوفے تک جمعرات کی دوپہر سے جمعے کی صبح تک چکر کاٹتا رہا۔ یہی میرا مکان تھا یہی میرا زمان۔

اگر تفتیشی سپرنٹنڈنٹ نے ایک لمحے کو بھی میرے بیان پر شک کیا ہوتا تو میں اسے سب کچھ بتا دیتا اور ان سب حقائق کی روشنی میں یہ فیصلہ اُس پر چھوڑ دیتا کہ میں کس حد تک مجرم یا معصوم ہوں۔ مگر میں نے جرم اور بےگناہی کے درمیان معمے کو اپنے سر کے اوپر لٹکتا چھوڑ دیا۔ اس طرح جو کچھ میری نظر سے پوشیدہ تھا مجھے خوف زدہ کرنے لگا۔

جب کبھی میری اپنے کسی ساتھی یا افسر سے کوئی تکرار ہو جاتی ہے تو میں بحث کو ایک حد سے آگے بڑھ کر جھگڑے یا رنجش کی شکل اختیار نہیں کرنے دیتا۔ کسے معلوم کہ یہ شخص کسی طرح میرے رسوا کن راز سے واقف ہو گیا ہو اور ایک لمحے میں اُس دیوار کو مسمار کر ڈالے جسے خوف نے روز بہ روز مستحکم کیا ہے اور اُس شے کو میرے سر پر دے مارے جس سے میں برسوں سے اسی حفاظت کرتا چلا آیا ہوں، میرے چہرے سے وہ نقاب نوچ لے جسے گھونگھے کی سیپی کی طرح، کچھوے کے خول کی طرح دن بھر میں ایک ایک دن رات ایک ایک لمحہ گزارتا رہا ہوں، اور یہ بات ایسی نہیں کہ میں سمجھوتوں سے عاری ہوں مگر پھر بھی محتاط ہوں۔ اس لیے میں ہر شخص میں کوئی شے اُبھرنے سے پہلے ہی پسپائی اختیار کر لیتا ہوں کہ کہیں وہ میرے ماضی کو کھنگال کر مجھ پر کوئی مہلک وار نہ کر دے۔ مجھے اب تک اُس دن کی دہشت یاد ہے جب میری اپنے ایک مدرّس ساتھی سے تکرار ہو گئی تھی اور پھر مجھے پتا چلا تھا کہ اُس کا ایک رشتہ دار کبھی شیخ مدنجد کی گلی میں رہا کرتا تھا۔ اس لیے، گو کہ اُس نے تو بحث کے دوران میرے معاملے کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا اور گو کہ تکرار کے دن میری اُس سے صلح ہو گئی میں نے اُسی دن اُس شہر سے تبادلہ

کرانے کی کوشش شروع کر دی اور جب تک اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو گیا سکون کا سانس نہ لیا۔

اُس روز مجھے احساس ہوا کہ میرے خلاف اس الزام نے میری شخصیت کو کس حد تک دوغلے پن کا شکار بنا دیا ہے، ایسا دوغلاپن جس کی سرطانی ابتدا میری زندگی کے قصّے میں کسی نامعلوم لمحے میں ہوئی تھی، شاید اُس روز جب میں اپنے کمرے سے اتر کر شیخ مدیحہ کے فلیٹ میں گیا تھا، اور بلاشبہ اس میں اُس روز مزید بگاڑ پیدا ہو گیا تھا جب میں تفتیشی مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوا تھا اور اُسے آدھے حقائق بتائے تھے اور آدھے حقائق کو چھپا کر ان سے انکار کر دیا تھا۔ اور آج میں خود کو جسے مانتا ہوں اُس پر عمل نہ کرنے اور جو کام کرتا ہوں اس پر یقین نہ رکھنے کی کشمکش میں گرفتار، اور ایسی شرمندگی کا شکار پاتا ہوں جو اس کشمکش سے بھی تلخ تر ہے کیوں‌کہ میں جو کچھ ظاہر کرتا ہوں وہ اس سے مختلف ہے جسے اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہوں۔

ایک شام جب میری ایک رشتےدار، ایک مطلقہ عورت جو مجھ سے شادی کی آس لگائے ہوئے ہے (جب کہ میں نے، اُس کی شادی اور طلاق سے پہلے، اُس سے شادی کرنے کے بارے میں سوچا تھا)، مجھ سے ملنے آئی تو اس نے اپنی دل کشیوں کو ایسی کھلی اور واضح دعوت کے ساتھ عریاں کیا کہ میری خواہش بیدار ہو گئی۔ لیکن آخری ہدف کو پہنچنے سے پہلے، جب اس نے مجھے استفہامیہ الجھن سے دیکھا، جیسے میں خود کو دیکھا کرتا تھا، تو میری شہوت جاتی رہی۔ یہ بات ظاہر تھی کہ اس موقعے پر میرا دھیان بٹانے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ میں ایک دلکش عورت کی توجہ اور مہربانی کا مرکز بننے پر خوش تھا اور مجھے کم سے کم اس کی توجہ کا جواب توجہ سے دینا چاہیے تھا۔ بہرحال، اس نے بڑی مہارت سے صورت حال کو سنبھال لیا اور کوئی اشارہ نہ دیا کہ اُسے لپٹنے چمٹنے اور سرگوشیاں کرنے میں ظاہر ہونے والی جذباتی قربت سے بڑھ کر کسی چیز کی توقع تھی۔ لیکن جب میں تنہا ہوا تو مجھے احساس ہوا کہ مدیحہ، زینب، اُس کی چہلیں، اور چلانے، اشارے کرنے اور چہ میگوئیاں کرنے والے لوگ، اور تفتیش کرنے والا

Scanned with CamScanner

مجسٹریٹ، سب میری ارضی گہرائیوں میں اتر چکے ہیں اور وہاں سے میری ناطاقتی کا عمل پڑھ رہے ہیں تاکہ میں میخ ہو جاؤں اور فصل ہونے کی مسرت سے محروم رہ جاؤں۔ جس بات کا پہلے مجھے اندازہ تھا اس کی اب تصدیق ہو گئی: کہ میں جس چیز کی خواہش کرتا ہوں وہ مجھے حاصل نہیں ہوتی اور جو مجھے حاصل ہے میں اس کی خواہش نہیں رکھتا۔ اور یہ کہ میرا وجود نارسا خواہش اور بےخواہش رسائی کے درمیان واقع ہے۔

جو بات مجھے سب سے بڑھ کر خوف زدہ کرتی ہے وہ میرا کامیاب یا ممتاز ہونا ہے۔ پچھلے سال میں نے مختلف جماعتوں کے جن طالب علموں کو پڑھایا تھا وہ سب کے سب پاس ہو گئے، اور میں ان کی اور اپنی کامیابی پر مسرور ہوا۔ مگر مجھے جلد ہی پتا چل گیا کہ مجھ سے ایک بھیانک جرم سرزد ہوا ہے، میرے ساتھیوں نے اسے اپنے پر ذاتی حملہ سمجھا اور ان میں جو مجھ سے قریب ترین تھے انھوں نے اجنبیوں سے پہلے جوابی کارروائی کی۔ شاید انھیں خوف تھا کہ ان کے طالب علم جماعت سے باہر پڑھنے کے لیے مجھ سے رجوع کریں گے اور اس طرح میں انھیں ان کی اضافی آمدنی سے محروم کر دوں گا، حالاں کہ میں اوّل تو جماعت سے باہر پڑھاتا ہی نہیں تھا، اور اگر بہت مجبوری آ پڑے تو بےقاعدگی سے اور بغیر معاوضے کے پڑھاتا تھا -- اوڑ یہ بات انھیں اور بھی زیادہ کھٹتی تھی۔ انھوں نے اسکول کے ہیڈماسٹر کو، ضلعی انسپکٹر کو اور وزارت تعلیم تک کو شکایتیں بھیجیں اور مجھ پر الزام رکھا کہ میں اپنے طالب علموں کو امتحان میں آنے والے سوال پہلے سے بتا دیتا ہوں۔ جب مجھ سے بازپرس کی گئی تو معلوم ہوا کہ پرچہ میں تیار نہیں کرتا، اور امتحان میں آنے والے سوالوں کی مجھے پہلے سے خبر نہیں ہوتی۔ لیکن مجھے اصل میں جس بات کا خوف تھا وہ یہ تھی کہ میرے محاسبوں میں سے کوئی میرے ماضی کی تہوں کو کرید کر واقف ہو جائے گا کہ میں اس مقدمے میں ملوث رہ چکا ہوں، جس سے مجھے ناقابل تلافی شکست کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس دن سے لے کر میں جان گیا کہ اگر مجھے سلامت رہنا ہے تو پس منظر ہی میں رہنا چاہیے؛ اگرچہ میں اپنے تدریس کے شوق یا خلوص سے دست بردار نہیں ہو سکتا، مگر کم سے کم مجھے اس کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے اور امید رکھنی چاہیے کہ میرے طالب علموں میں

Scanned with CamScanner

سے ایک آدھ ضرور امتحان میں ناکام رہے گا۔ لیکن اُسی روز مجھ پر یہ افسوس ناک انکشاف بھی ہوا کہ میرا معاملہ میری خواہش پر منحصر نہیں ہے، کہ میرے طالب علم میرے نہ چاہنے پر بھی سب کے سب پاس ہو سکتے ہیں اور اس طرح میرے بارے میں شکوک دوبارہ بیدار ہو سکتے ہیں۔ اُس روز سے لے کر میں نے درست اور غلط میں فرق کرنا چھوڑ دیا، یہ جان کر کہ میرے بارے میں فیصلہ کرنے والا میں نہیں کوئی اور ہے، اور میں نہیں جان سکتا کہ کس سزا یا انعام کا مستحق ہوں۔

جب تفتیشی میجسٹریٹ نے مجھے جانے کی اجازت دی تو مجھے اس کی بات پر یقین نہ آیا، کیوں‌کہ اس کا مجھے دیکھنے کا انداز تمام تر مشکوک تھا۔ وہ مجھے آزاد ہونے کا فریب دینا چاہتا تھا تاکہ میرے برتاؤ اور اعمال کی نگرانی کر کے وہ شہادت حاصل کر سکے جو میرا جرم ثابت کر دے، اس لیے مجھے اُس سے ہزارگنا زیادہ محتاط رہنا ہو گا تاکہ اسے اس کا مقصد حاصل نہ ہو۔

اُن چپّلوں کی بابت میں نے جمعرات کی رات کو پتھروں سے بھر کر دریائےنیل کی ایک قریبی نہر میں پھینک دیں۔ وہ کسی بھی وقت سطح پر آ سکتی ہیں، اور ان کے ساتھ میرا جرم بھی! یا ہو سکتا ہے کوئی مچھیرا انھیں نکال لے اور تفتیش دوبارہ شروع ہو جائے اور شہادتوں سے ثابت ہو کہ میری گردن پھانسی کے پھندے کی مستحق ہے۔ اس سچ سے قطع نظر جو کسی کو، خود مجھے بھی، معلوم نہیں۔

میں نے اپنی زندگی کے اس لمحے کو ہلاک کرنے کی کوشش میں بہت سے طریقے اختیار کیے، مگر آخرکار مجھے پتا چلا کہ میں دراصل اپنےآپ کو ہلاک کر رہا ہوں۔ مثلاً مجھے معلوم ہوا کہ اُس زمانے میں میرے جینے والے ہمسایوں، دوستوں اور رشتےداروں پر مشتمل تھے ...جیسے میرا عم زاد جس نے عدالتی تحقیقات کے دوران میرے لیے وکیل کرنے کی زحمت اٹھائی... اور میں نے ان سب سے ملناجلنا ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا؛ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے مُردہ تصوّر کر لیں اور میں انھیں۔ ابتدا میں میں اپنی کوشش میں

کامیاب رہا، لیکن اس کے انجام نے مجھے حیران کر دیا، کیونکہ جب بھی میں نے کسی ہمسائے، دوست یا رشتے‌دار سے تعلق ختم کیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرے وجود کا ایک حصہ چھوڑ گیا ہے، حتیٰ کہ آج میں اپنے‌آپ کو مشکل سے پہچان پاتا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی میں نے فرار کی راہ اختیار کی، اپنے تعاقب کرنے والے سے نہیں بلکہ اپنے‌آپ سے فرار ہوا۔ میرے پاس اس کا ثبوت یہ ہے کہ بہت برسوں تک میں اُن لوگوں سے کترانے میں کامیاب رہا جو دیکھ کر یا سن کر میرے اُس مقدمے سے واقف ہوئے تھے، لیکن چند سال پہلے ناگاہ میری اُس تفتیشی مجسٹریٹ سے مڈبھیڑ ہو گئی جو اب، بظاہر، ایک معمر اور بھاری بھرکم جج بن چکا تھا۔ وہ عمدہ لباس پہنے اور آفٹرشیو کی مہک میں بسا ہوا، ٹرین کے کھانے کے ڈبّے میں، میرے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اُس نے خوش مزاجی سے پکار کر کہا، "شجر مدینہ کے مقدمے کا کیا بنا؟" میں نے خود پر اور دوسروں پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ ان لفظوں کا مخاطب میں نہیں ہوں۔ لیکن اس کی نظروں میں واضح طور پر اشتباہ تھا اور اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اُس لمحے مجھے معلوم ہوا کہ میرا وجود میرے چہرے پر درج ہے، میرے سفید بالوں، جھرّیوں اور اُن مونچھوں کے باوجود جو میں نے بعد میں رکھ لی تھیں۔ اس ڈر سے کہ کہیں کوئی ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے، میں نے مضطرب ہو کر سرگوشی کی، "مجھے نہیں معلوم۔"

وہ اپنی ہموار آواز میں بولتا رہا،

"اہم بات شہادت ہوتی ہے۔ جس بات سے تم نے تفتیش کے دوران انکار کیا، یا اگر تم اس کا اقبال بھی کر لیتے، وہ کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اقبال جبراً بھی حاصل کیا جا سکتا ہے، یا اس کا سبب کسی اور شخص کو بچانے کے لیے خود کو قربان کر دینے کا جذبہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے کسی مقدمے کے انجام کے لحاظ سے وکیل کی اہمیت ملزم سے زیادہ ہے؛ اس بات سے قطع نظر کہ اپنے خلاف پہلی گواہی خود ملزم کی ہو، وکیل شہادت قائم کرتا یا اسے غلط ثابت کرتا ہے۔ اہم بات ـــــ"

یوں جیسے ہم کسی کورس کا حصہ ہوں، میں جملہ پورا کرنے میں اُس کے ساتھ شامل ہو گیا،

"ـــــ شہادت ہوتی ہے۔"

پھر میں نے ہمت کی اور چالاکی کو پوشیدہ رکھتے ہوئے اُس سے پوچھا،

Scanned with CamScanner

"تو کیا وہ اب تک... شہادت کا انتظار کر رہے ہیں؟"

اپنا نغمہ جاری رکھتے ہوئے اس نے مجھے جواب دیا

"فائل اب تک موجود ہو گی، خواہ مقدمے کا تفتیشی مجسٹریٹ تبدیل ہو چکا ہو؛ کہیں سے کسی بھی وقت کوئی چیز آ کر اس فائل میں اضافہ کر سکتی ہے۔"

میں اس کا جواب اُس کے ان لفظوں کے ادا کرنے سے پہلے ہی جان گیا تھا؛ یہ بالکل ایسا ہی تھا کہ کوئی شخص کسی ایسی بات کی تصدیق چاہ رہا ہو جس سے وہ پہلے سے واقف ہو۔ اس کے باوجود اس کے جواب نے مجھے خوف میں مبتلا کر دیا۔ اس لیے ...اور اس ڈر سے کہیں وہ اپنی نغمہ سرائی دوبارہ شروع نہ کر دے... میں نے اس سے کوئی اور بات دریافت کرنے کا ارادہ کیا۔ مگر وہ مجھ سے پوچھ گچھ جاری رکھنے پر مصر تھا؛ میں کہاں جا رہا ہوں؟ ایک لمحے کو میں نے سوچا کہ اُس سے یہ بات چھپا لوں، مگر پھر ڈر ہوا کہ ہو سکتا ہے اُس کا اسٹیشن میرے اسٹیشن کے بعد پڑتا ہو اور میرا جھوٹ کھل جائے اور مجھے پفیٹی مرے انجام سے دوچار کر دے۔ اس لیے اپنے سفر کی منزل صحیح صحیح بتا دینے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، جس کے بعد میں نے اس سے بات کرنے سے گریز کیا، اگرچہ وہ کچھ کچھ دیر کے بعد مجھ سے میرے مقدمے سے متعلق، یا غیرمتعلق، بات پوچھ کر مجھے دہشت زدہ کرتا رہا۔

میں نے اپنے تمام پرانے دوستوں کو ترک کر دیا اور ان کے بجائے ایک واحد دوست کو اختیار کیا جو میرے ماضی کے اور میرے درمیان ایک دیوار قائم کر دے؛ میں اُس میں پناہ لے سکوں اور خود کو چھپا سکوں۔ لیکن ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ وہ میرے پرانے تفتیشی مجسٹریٹ سے واقف ہے جو اس کا ہم سایہ بھی ہے اور رشتےدار بھی۔ ہو سکتا ہے وہ اتفاق سے اُس کے سامنے میرا ذکر کر بیٹھے، جیسے اس نے اتفاق سے میرے سامنے اُس کا ذکر کر دیا تھا، اور اس طرح اس دیوار کو مسمار کر دے جس کے پیچھے میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا ہوں، اور میں اُس شے کے پھندے میں جاؤں جس سے فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہوں؛ اگر صوی اس سے دوستی نہ ہوتی تو اس کی زبان سے میرا نام نکلنا ممکن نہ ہوتا۔ اُس دن سے مجھے احساس ہو گیا کہ میرے دوستوں کی تعداد بڑھنے سے میرے محرم ٹھہرنے کا امکان بھی بڑھ جائے گا کیونکہ مجھے کیا معلوم اُن میں سے کون میرے

پرانے تفتیشی مجسٹریٹ سے رابطے میں ہو یا اُن میں کون کسی پرانے شئے میں مبتلا ہو۔ ان تمام باتوں سے مجھے یقین ہو گیا کہ میں حقیقت سے فرار ناممکن ہے کہ میری زندگی ہی میرا اصل سوہان ہے اور نہ کہ میرا وجود ہی میرے المیے کا لبّ لباب ہے۔

جس بات نے مجھے سب سے زیادہ مضطرب کیا وہ یہ تھی کہ جس وقت میں نے اپنے دوست سے تعلق قطع کرنے کا فیصلہ کیا اُسی وقت اس نے مہربانی کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک روز اس نے مجھے اپنے گھر ایک بڑی دعوت میں بلایا اور اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اور لوگوں کے علاوہ میرا پرانا تفتیشی مجسٹریٹ بھی دعوت میں شامل ہو گا۔ ادھر میں دہشت سے لرز رہا تھا اور اُدھر میرا دوست بلاشبہ یہ سوچ رہا تھا کہ میں بااثر لوگوں سے ملاقات پیدا کرنے اور خوب صورت، خوش لباس عورتوں اور مسرور، خوش ادا لڑکیوں کو دیکھنے، ان کی خوشبو کو محسوس کرنے اور ان کی ہنسی کے سننے میں مست ہونے کے خیال سے کس قدر خوش ہوں گا۔ یہی وجہ تھی کہ میرا دوست میرے چہرے پر آ جانے والے یاس کے گہرے اور انتہاہ تاثر کو نہ سمجھ سکا .. اور ہرگز نہ سمجھ سکتا تھا اپنے تردّد کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں معذرت کرنے کی شائستگی یا ہمت پیدا نہ کر سکا۔ لیکن جب دعوت کا دن آیا تو میں نے خود کو یقین دلا لیا کہ میں اس قدر بیمار ہوں کہ اپنے دوست کے گھر ہرگز نہیں جا سکتا، اس لیے میں اپنے کمرے میں پڑا رہا اور مصمم ارادہ کر لیا کہ آئندہ اپنے دوست سے ممکن حد تک گریز کروں گا کہ کہیں وہ نادانستگی میں مجھے اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال سے دوچار نہ کر دے۔ گو اس بار میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا، مگر کسے معلوم کہ اگلی بار کامیاب ہوں گا یا نہیں۔ بلاشبہ میرا دوست میرے اس رویے کی کوئی توجیہہ نہ کر سکا اور اس بات نے اُسے، شاید بہت دنوں تک، حیران رکھا۔

ایک دن میں تعصبات کے بارے میں لیکچر دے رہا تھا کہ ایک طالب علم نے اس سوال سے مجھے مخمصے میں ڈال دیا کہ ماں کے رحم میں لوٹ جانے ور

دوبارہ جنین کی شکل اختیار کر لینے کی آرزو (کتاب کا صفحہ ۶۱) ذات کی دفاع ہے یا ذات کا خاتمہ؟ اگرچہ میں اپنے بعض کمسن ور طالب علموں کے سوالوں پر شک کرنے کا عادی ہو گیا تھا، لیکن اس سوال نے میرے عمگین احساسات کو اس طرح بیدار کر دیا کہ میں تقریباً رو پڑا ۔۔ خاص طور پر اس لیے کہ میں اس سوال کا جواب دینے کے لیے مناسب طور پر تیار نہ تھا۔

جب انسپکٹر میرے بارے میں رپورٹ لکھنے آیا تو وہ اعتماد کے ساتھ ہنس رہا تھا۔ میں نے اُس طالب علم کا سوال اس کے سامنے دوہرایا:

"ماں کے رحم میں لوٹ جانے کی آرزو ذات کا دفاع ہے یا ذات کا خاتمہ؟"

اس کے چہرے پر اچانک افسردگی چھا گئی اور وہ سرگوشی میں بولا:

"دیکھو، میرے بیٹے، یوں تو یہ ذات کا دفاع ہے لیکن اس کا انجام ذات کا خاتمہ ہے۔"

وہ ایک ہم درد اور فہم رکھنے والا انسپکٹر تھا اور ان دوسرے انسپکٹروں اور ہیڈماسٹروں سے مختلف تھا جن کے ساتھ میں نے کام کیا تھا۔ شاید اس کی بات نصاب میں لکھی ہوئی معلومات کی نہیں بلکہ اُس کے جھیلے ہوئے کسی تجربے کی بنا دیتی تھی۔ اس لیے میں نے اس بات کا کوئی تردّد نہیں کیا کہ اس نے اپنی رپورٹ میں کیا لکھا ہو گا۔

ور اب جب رات آئی ہے تو میں اپنے کمرے کی کھڑکیاں احتیاط سے بند کر لیتا ہوں، دروازے کے سوراخ میں کنجی اٹکا دیتا ہوں، جسے پہلے کبھی کرتا تھا۔ میں کچھ نہیں سیکھا اور اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔ میں گھٹنے موڑ کر اس انداز میں سوتا ہوں جیسے بچّہ ماں کے رحم میں سوتا ہے۔ میں رات سے، رات کی غم ناکی سے کس قدر دہشت زدہ ہوں! میرے کمرے کی بےحوائی اور اضطراب کیسا ہولناک ہے!

یہ میرا قلعہ بھی ہے اور میرا جال بھی۔ اب میں اسے اپنے تمام حو سوں کی مدد سے پہچانتا ہوں: اس کی دیو ریں، کھڑکیاں اور اینٹوں کے فرش کا رنگ۔ اس کا وہ حصّہ جو پہلے کی طرح ہے اور وہ جو بدل گیا ہے، اس کے چھت کے پاس والے کونے جن میں مکڑیوں کے جالے ہیں، فرش کے پاس والے گوشے جو گردآلود ہیں؛ بہت دنوں تک بند رہنے سے پیدا ہو جانے والی بُو، ور میرے کھانا پکانے کی بُو، اور اس سے ملحق غسل خانے سے آنے والی بُو۔ یہاں تک کہ میں اس کی دیواروں کے نچلے حصّوں کا دائقہ بھی جانتا ہوں،

سعید، ٹھرٹھرا ور سکیں۔ دیواریں زور بہ زور پہلی ہوئی جا رہی ہیں اور مجھے خوف ہے کہ ایک دن مجھے پتا چلے گا کہ یہ بالکل کھوکھلی ہو چکی ہیں اور میرے تمام منصوبے بنیادوں تک مسمار ہو جائیں گے۔ اس کی آوازوں سے بھی میں پوری طرح آشنا ہوں؛ چوکس، پُراسرار آوازیں۔ جو بات مجھے دہشت میں مبتلا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ آوازیں نامعلوم جگہوں سے اٹھتی ہیں۔ اُن کی توجیہہ کرنے کی کوشش مجھے پُرسکون کر دیتی ہے؛ شاید کوئی چوہا کوزےدان میں خوراک کے ریزوں پر منہ مار رہا ہو گا یا کوئی لال بیگ غسل خانے میں خوشی سے مست ہو رہا ہو گا۔ پھر دوسری آوازیں ہیں، دور یا نزدیک کی، اوپر یا نیچے سے آتی ہوئی، جو رات کی تاریکی اور سکوت میں بڑھتی چلی جاتی ہیں؛ جھپٹتی کرتی یا لڑتی ہوئی دو بلیاں، بھونکتا ہوا کتا، بڑھتا ہوا قدم، ٹوٹتی ہوئی چیزیں۔ جس طرح میں اپنے کمرے سے مانوس ہو گیا ہوں بالکل اُسی طرح لگتا ہے یہ بھی میرا عادی ہو گیا ہے؛ میری دھڑکن جو تیز ہوتی ہے تو ڈھول کی دھمک جیسی ہو جاتی ہے اور جب دھیمی پڑتی ہے تو تقریباً رک جاتی ہے؛ جب میرا سانس تیز ہوتا ہے اور پھر ساکت ہو جاتا ہے؛ یہ کمرہ بھی میری بےخوابی اور میرے اضطراب کا شاہد ہے اور اس کا کہ میں کام سے واپس آ کر اس میں داخل ہو جاتا ہوں اور پھر اگلی صبح سے پہلے اس سے باہر نہیں نکلتا، اور اس کا بھی کہ نہ میں کسی سے ملنے جاتا ہوں اور نہ کوئی مجھ سے ملنے آتا ہے۔

اور اس طرح اسی آزادی برقرار رکھنے کی خاطر، میں نے اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دی ہیں۔ خود میں نے اپنےآپ کو قید کر لیا ہے تاکہ کسی اور کو یہ زحمت نہ کرنی پڑے، اور میرے اسمِ اعظم کا میرے ہاتھ میں ہونا اس سے بہتر ہے کہ یہ کسی اور کے ہاتھ، یا گرفت یا مٹھی میں ہو۔

پس نوشت

یہی تمسم کی بدولت ... اور بعض اوقات مشغلے کے طور پر ... میں نے افسانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جہاں تک خود لکھنے کے تجربات کا تعلق ہے، وہ مجھ سے میرے پروفیسروں کی جانب سے کیے جانے والے مطالبوں یا اُن حصوں تک محدود رہے ہیں جو میں اپنے باپ کو، خدا اُس کی روح کو سکون بخشے، لکھ کر دیتا تھا۔ تحریر کے باب میں یہی میرا کل تجربہ ہے، اور یہی

وجہ ہے کہ میں اس قصے کا موجد تو ہوں مگر مصنف نہیں۔ اس کا مصنف وہی شخص ہے جس کا نام عنوان کے ساتھ درج کیا گیا ہے کیونکہ میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اپنے خلاف جانے والے لفظوں کو تحریر میں لے آؤں جو شاید میری معصومیت کے گواہ ہوں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میرے جرم کی جانب اشارہ کرتے ہوں۔ اس لیے میں نے اپنی عمر اور پہچان چھپائے رکھا ہے چونکہ میرا نام اور پیشہ فرضی ہے۔ اپنی ذات تک پہنچ پانے والے ان راستوں کو میں نے اسی طرح مسدود کر دیا ہے جس طرح دروازے کے سوراخ میں کنجی اٹکا کر اسے بند کر دیتا ہوں۔ میں انسانوں کا شائق نہیں ہوں، نہ مجھے عظمت کی جستجو ہے جس شے سے بھی میرا انکشاف ہو سکے مجھے اس کے بارے میں دھڑکا لگا رہتا ہے، کیوں کہ نہ کوئی شہادت بھی ثابت ہو سکتی ہے جو میرے خلاف کھلی ہوئی فائل میں اضافہ کر دے۔ اسکول کی تقریبوں میں مَیں اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر گنگ رہ جاتا ہوں جو تقریریں کر کے اور اپنے طالب علموں کی سرگرمیوں کی رہنمائی کر کے نمایاں ہونے کی دوڑ میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرتے ہیں، اور میں ترحّم سے ان کی جانب اشارہ کرتا ہوں؛ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی ذات کو مجرم ٹھہرا رہے ہیں۔ اس سبب سے میں جان بوجھ کر پچھلی صفوں میں بیٹھتا ہوں اور جب فوٹوگرافر آتا ہے تو احتیاط کرتا ہوں کہ اپنا چہرہ آگے بیٹھے ہوئے مرد یا عورت کی آڑ میں کر لوں تاکہ میری موجودگی کا نشان نہ رہے اور اسے کسی دن میرے خلاف شہادت کے طور پر پیش نہ کیا جا سکے۔ تاہم ان میں سے ایک تصویر کو دیکھ کر مجھے معلوم ہوا کہ میں نے اپنا چہرہ بہت واضح انداز میں چھپایا ہے اور کوئی بھی شخص اسے دیکھ کر محسوس کر سکتا ہے کہ میں ڈھونڈ لیے جانے سے بچنے کی کوشش میں ہوں، اور یوں مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میرا چہرہ مجھے اشتباہ سے دوچار کر سکتا ہے تو اسے چھپانے کی کوشش اس سے بڑھ کر ایسا کر سکتی ہے۔ اس لیے میں نے خود کو دوسرے لوگوں کی آنکھوں، کانوں اور ناکوں سے بہت دور کر لیا، کیونکہ کسی وسیع اور پُرہجوم مقام پر میرا موجود ہونا ہی میری ذات کا اعلان اور ان شبہوں کی بنیاد ہے جو اس اعلان سے جنم لیتے ہیں۔ اسی لیے کسی کمرے یا کلب میں بیٹھنے سے میں اضطراب اور گھٹن کا شکار ہو جاتا ہوں جہاں دھندلی نگاہیں مجھے ٹٹولتی اور میرا جائزہ لیتی ہیں، مجھ پر حملہ کر کے مجھے مفلوج کر دیتی ہیں، اور جہاں کوچہ گرد

کان کسی اشنیدہ یا نیم اشنیدہ کے شکار کی تلاش میں ہیں اور جہاں ہمیشہ دوسرے لوگ ہوتے ہیں جو مجھے چھو کر یا سونگھ کر دریافت کر لیتے ہیں جنگ میں دوسروں کو پاس کرتے، چیختے چلاتے، کھیلتے تالیاں بجاتے، قہقہے لگاتے، پیتے پلاتے کھاتے اور یہ جانتے ہوئے دیکھتا ہوں اور خود سے سوال کرتا ہوں کہ ان میں سے کون سے ملزم ہیں اور کون سے گواہ، کون سے مجرم ہیں اور کون سے منصف، کون سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور استغاثے کے وکیل ہیں اور کون سے میری طرح ہیں، نہ ملزم، نہ معصوم اور نہ مجرم۔ اور اس طرح کامیابی اور شہرت اور ہر چیز جو لوگوں کے خیال میں خوشی کا باعث ہوتی ہے میرے نزدیک شدید یاس اور اندوہ کا منبع ہے۔

ہر سال میں خود سے کہتا ہوں: "اس سے پہلے کہ زندگی میرے لیے عذاب بن جائے، یہ میری آخری سالگرہ ہے کسی تقریب یا رسم کے بغیر۔" ہر مہینے میں خود سے کہتا ہوں: "یہ میری آخری تنخواہ ہے اس سے پہلے کہ میری نوجوانی کی سزا کے طور پر میری پختہ عمری کو فنا کر دیا جائے۔" ہر ہفتے میں خود سے کہتا ہوں "یہ میرا آخری جشن ہے، اس سے پہلے کہ مجھے اس کا مجرم بنا دیا جائے جس سے خود کو الگ کرنے کی تو سر توڑ کوشش کرتا رہا ہے اور جس میں انہیں لگتا ہے کہ تو اور گہرا اتر گیا ہے۔" اور ہر روز شیو کرتے ہوئے میں خود سے کہتا ہوں: "یہ آخری صبح ہے جب تو اپنے کمرے کو دیکھ رہا ہے اس سے پہلے کہ وہ دروازہ توڑ کر میری خلوت میں داخل ہو جائیں۔" اور ہر سال اور ہر مہینے اور ہر ہفتے اور ہر روز میں خود کو موجود پاتا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اپنے کمرے کی چاردیواری میں سانس لے رہا ہوں، اگرچہ اگلے لمحے یا اس سے اگلے لمحے اپنی تقدیر کی پیش گوئی کرنے سے بالکل قاصر ہوں۔ جب کبھی میں اپنی سالگرہ کرتا ہوں یا تنخواہ وصول کرتا ہوں، یا جشن اور شیو کرتا ہوں، تو خود سے کہتا ہوں "اب تو اس لمحے کے لیے تیار ہے جو آ رہا ہے، اور یقیناً ضرور آئے گا۔" اس طرح وقت کے ہر موڑ پر میرا خوف نئے سرے سے تازہ ہو جاتا ہے؛ نہ زنگ خوردہ ہوتا ہے اور نہ پھیکا پڑتا ہے۔

لیکن اگرچہ میں اپنے کمرے میں پناہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوں پھر بھی مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ میرا وجود، جس کی ابتدا پہلی سطر کے پہلے لفظ سے ہوئی تھی، اب کم و بیش اپنے انجام تک پہنچ رہا ہے۔۔۔ میں فقط ایک حد تک گیا ہوں جو چند لمحوں کے لیے ایسا احساس کراتی ہے،

جیسے کوئی زلزلہ یا ہوائی حملہ یا کسی سنگین جرم کی سنسنی، اور جلد یا بدیر زندوں اور مُردوں کے ہجوم میں کھو جاتی ہے۔

پس نوشتہ

میں خوف زدہ ہوں، اس لیے غیرموجود ہوں۔

ادوَرد الخرّاط

امگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

چار دیواروں میں

"ہانیتا ... ہانیتا"

اُس کی آنکھ اس بوڑھی کم زور آواز پر کھلی جو ماما کی دردمندی بڑھاپے کی حسب حالی اور ایک طویل، تھکا دینے والی زندگی سے بوجھل تھی۔ یہ آواز ادھ کھلے دروازے سے داخل ہوئی اور کمرے کی فضا اور اس میں پھیلی ہوئی صبح کے اوّل وقت کی غنودہ نیم تاریکی میں سے ہو کر اُس تک پہنچی۔ باہر گلی میں لگے ہوئے لیمپ کی ہلکی، دُھندلی روشنی کمرے کی دیوار پر پڑ رہی تھی۔ کمرے میں ابھی رات کا سانس باقی تھا اور اس کی گرم، گھنی اور بند بند سی بُو میں نیند کی بُو بھی ملی تھی۔

وہ بستر کے گدے پر کروٹیں بدلتے ہوئے اُس کھردرے مانوس کمبل کو اپنی رانوں کے گرد کسنے لگی جو اس کے بدن سے متواتر مَس ہوتے رہنے کی وجہ سے یوں ہو گیا تھا گویا اسی کا کوئی اندرونی حصہ ہو۔ جب اُس نے بازو اپنے گرد کس کر ٹانگیں وہاں تک موڑیں کہ وہ اس کے سینے کو بھینچنے لگیں، تو اسے یہ کمبل اپنے گرد لپٹے ہوئے غلاف کی طرح محسوس ہونے لگا۔ اسے اپنے بازوؤں اور ٹانگوں کو اپنے گرد یوں لپیٹ کر بڑی تسکین ہوئی جیسے انھوں نے اس کے بدن کو حصار میں لے لیا ہو اور اس کا بدن اپنے ہی

مانوس اور مطیع لمس میں سکون پا کر پوری طرح حفاظت میں آ گیا ہو! اس حصار میں کسی خطرے کا گزر نہ تھا، بلکہ صرف تحفظ اور محبت کا لمحہ تھا۔ اپنے آپ سے مکمّل لطف لیتے ہوئے، اور اپنے گرد اس کھردرے اور آرام دہ کمبل کو لپیٹ کر، اس نے اپنے منھ اور ٹھوڑی کو اپنی ٹانگوں سے بھینچ لیا؛ اس کے ہونٹ گھٹنوں اور رانوں کو چھونے لگے اور چہرہ اس کے بدن میں چھپ گیا۔ اس کے اندر سے حرارت کا جوار پھُوٹا اور اس کا بدن پُرسکون ہو گیا؛ ایسی قربت، ایسی سپردگی، ایسی سادہ تسکین اسے کسی اور چیز یا کسی اور فرد سے حاصل کرنے کا موقع کبھی نہیں ملا تھا۔ کوئی چیز اس سے مشابہت نہیں رکھتی تھی۔ کوئی چیز اس مکمّل اور خالص قربت تک نہیں پہنچی تھی۔ باقی سارے رشتوں میں کوئی ایسی علیحدگی، کوئی ایسی رکاوٹ تھی جو ہر تسکین، ہر تکمیل کو غارت کر دیتی تھی۔

یہ بات اس کی ماں کے معاملے میں بھی صدق آتی تھی جو اس وقت اسے جگا رہی تھی؛ اس کی آواز بڑھاپے سے کم زور ہو کر ایک یاس انگیز، کوشش کر کے پیدا کی ہوئی دردمندی تک رہ گئی تھی۔

اب اس کے دل کو ایک بیٹی کی نرمی نے جکڑ لیا جسے اپنی ماں سے محبّت تھی اور جو ایک ایسے پُرخطر کام میں اس کی شریک تھی جس کی حدیں جُرم سے جا ملتی تھیں۔ اُسے اس مبہم خطرے کی وجہ سے اپنی ماں پر ترس آنے لگا جو اُن دونوں پر منڈلا رہا تھا، ایک خطرہ جو نامعلوم اور غیرواضح ہوتے ہوئے بھی اُن سے باہر چاروں طرف، اور ان کے اندر بھی، ان کا منتظر تھا۔

اس کے باوجود اُس کی ماں اس سے فاصلے پر تھی، دوسرا فرد تھی۔ بڑھاپے کی جھرّیوں نے اس کے چہرے کی نرم جلد کو اپنے ہَل سے کھود ڈالا تھا، اس کی دھندلی، کم زور آنکھوں کو سیّال کر دیا تھا، اور اس کے سر کے نمک کے رنگ کے بالوں کو، جو ایک پرانی بدرنگ اوڑھنی میں چھپے ہوئے تھے، خشک کر ڈالا تھا۔ ان سب نے ان دونوں میں پار نہ ہو سکنے والی دُوری پیدا کر دی تھی، اور ماں کے واسطے اس کے نازک جذبے کو زیریں سطح پر پہنچا دیا تھا جیسے یہ جذبہ کسی محبوب شخص کی طرف سے آنے والے پیغام میں جھلک رہا ہو مگر وہ شخص بہت دور، کسی اور ملک میں رہتا ہو۔

اس نے بستر پر لیٹے لیٹے انگڑائی لی، پھر ایک لذّت انگیز حرکت سے

اپنے بازو اور ٹانگیں سکیڑ لیں؛ اس نے اپنا سر زانوؤں پر سے اٹھایا اور، آنکھیں میچے میچے، تکیے کی گود میں رکھ دیا جو اس کے رخسار کے رات بھر کے لمس سے نم اور گرم ہو رہا تھا۔ وہ کمبل لپیٹے، گدے اور تکیے کے گداز میں سے اپنے بدن کی خوشبو میں سانس لینے لگی جو نیند اور گرمی سے بوجھل ہو رہی تھی، بدن کی کروٹوں اور رات کے پسینے سے گندھی ہوئی خوشبو جو آنسوؤں کی اور مدفون خواہش کی چکناہٹ اور گاڑھےپن سے بھاری ہو رہی تھی۔ ہاں، اس کے پاس اس کے بدن اور اس کے گھر میں آنے والی چیزوں کے سوا کچھ اور نہیں تھا۔ اس کا بدن جو پوری دنیا پر محیط تھا اور جس کے باہر کوئی چیز وجود نہیں رکھتی تھی؛ کمرہ، گلی، لوگ، آسمان، ان سب کا اسے احساس تو تھا ۔۔اور اس کا احساس مبہم ہونے کے باوجود گہرا تھا۔۔ لیکن یہ سب اسے اپنے بدن کی سرحدوں پر محسوس ہوتے تھے، اُن حدوں پر جہاں اس کے بدن کا اختتام ہوتا تھا۔ ان حدوں سے باہر کسی چیز کا وجود نہیں تھا؛ ساری دنیا اُس چیز کی حدوں میں تھی جو اس کے پاس تھی۔ اُس کے پاس اس چیز کے سوا کچھ نہیں تھا اور وہ چیز صرف اُس کی تھی اور وہ اسے چادروں میں لپیٹ کر اس کی گرم، گھنی خوشبو میں سانس لے سکتی تھی، اس کی سب سے اندر کی تہوں میں خود کو لپیٹ سکتی تھی۔

اس کے باہر کبھی کسی چیز کا وجود نہیں رہا تھا۔ اُس کا شوہر، جو کسی زمانے میں اس کے پاس راتوں میں آیا کرتا تھا، کھردرا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کی عمر ڈھل رہی تھی، اس کی بُو میں کچّی پیاز، گودام کے گردوغبار اور خشک بوریوں کی چبھن ملی ہوئی تھی، کیوں کہ وہ پیاز کی آڑھت کرتا تھا۔ اسے اپنے شوہر کی دست اندازی بھی اپنے اوپر تجاوز محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اسے کچھ محسوس ہوتا تھا تو اس تنہا مخلوق کے لیے بس تھوڑا سا ترس جو اس کے پہلو میں، اس کے بازوؤں میں پناہ ڈھونڈتا تھا۔ اُس کا بےجان سر اس کے سینے پر تقریباً گر پڑتا تھا، اس کے جسم سے زندگی کی خوب زائل ہو چکی ہوتی اور وہ سوکھی ہوئی، عمررسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچا سا رہ جاتا جو کبھی کا مر چکا ہو۔

وہ درحقیقت دو سال پہلے مرا تھا۔ وہ اس پر کبھی غم کا احساس نہیں کر پائی تھی، کیوں کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کا نہیں ہوا تھا۔ جب اس نے کفن میں اس کے معمر، سوکھے ہوئے، کم قامت جسم اور زردی مائل سفید

جھاگ میں لتھڑے ہونٹوں پر نظر ڈالی تو اسے محض رحم کا ہلکا سا احساس ہوا اور وہ اس سے کچھ دور کھڑی ہوئی اسے جسے بہت فاصلے سے دیکھتی رہی۔

وہ اپنی ماں کے گھر لوٹ آئی تھی۔ چند قراط رسمی سے آنے والی قلیل سی آمدنی پر وہ بالائی مصر کے علاقے میں ایک جوان بیوہ کی زندگی گزارنے لگی تھی؛ قدیم دیواروں میں بند، چھت پر بنے ہوئے کمرے اور زینے کے اوپر والے باورچی خانے کے درمیان آنی جاتی ہوئی۔

لیکن اس کا بدن اس سے بغاوت میں اٹھ کھڑا ہوتا اور پوری دنیا نسکین نہ پانے والی خواہش سے دھڑکنے لگتی۔ اس کی اندرونی خواہشوں کی اس پُراسرار سرکشی نے اسے ایسی چوریں کرنے پر اکسایا جو کوئی لڑکی خاندان میں اس قسم کی صورتِ حال میں نہیں کرے گی -- اور ان چوروں کے لیے وہ خود کو یہی جواز دیتی کہ اب وہ کنواری نہیں ہے۔

وہ سرکاری اہلکاروں کی شہر میں پلی بڑھی بیویوں یا جدید زمانے کی اسکول کی طالبات کی طرح چہرہ بےنقاب کیے باہر آتی جاتی تھی۔ اس لیے وہ بھاری برقع اتار پھینکا تھا جس میں دیہات کی عورتیں خود کو سر سے پیر تک ملفوف رکھتی ہیں اور جسے پہنے پہنے وہ گلیوں میں سے گزرتی ہیں اور ان چلتے پھرتے، سیاہ اور پھڑپھڑاتے ہوئے خیموں میں سے ان کی آنکھوں کی چمکتی ہوئی پتلیوں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، جیسے وہ ممنوعہ اشیا ہوں جن پر نظر نہیں ڈالی جانی چاہیے، جیسے وہ دہشت ناک، غیرانسانی قوتوں کی حامل کوئی ملعون چیز ہوں۔

اگرچہ قصبے میں بھی یہ بات اہمیت رکھتی تھی لیکن اتنا سنگین مسئلہ نہیں تھی، کیونکہ وہاں سرکاری اہلکاروں کی بیویاں اور کچھ اور عورتیں یورپی لباس پہنے دکھائی دے جاتی تھیں، اُن کا اندار کچھ کچھ دیہاتی سا ضرور ہوتا لیکن لباس کی حد تک وہ بالکل شہر کی عورتیں دکھائی دیتیں۔ اصل سنگین بات یہ تھی کہ وہ کبھی کبھی اسی طرح بےنقاب حالت میں گاؤں میں بھی چلی جاتی تھی جہاں خاندانی زمینیں واقع تھیں، اور اس بات نے بےحد سنسنی پھیلا رکھی تھی۔ لیکن اس کی طبیعت میں ضد تھی، اور ایک بار کوئی راہ اختیار کر لینے کے بعد کوئی چیز اس کی راہ تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا گھرانہ -- وہ لوگ قبطی تھے -- باقاعدہ کسانوں کے پیشے سے تعلق نہیں رکھتا تھا، بلکہ وہ اپنے بیٹوں کو اسکول اور کالج بھیجتے تھے،

اور ان میں سے کئی اپنی تعلیم ختم کر کے اب قاہرہ میں ڈاکٹروں، انجینئروں اور کمپاؤنڈروں کی حیثیت سے رہ رہے تھے۔ لیکن دیہات کی بات اور تھی اور یہاں زینب کا یہ طرزِعمل سخت نامناسب تھا۔ خاندان کے ڈاکٹروں اور وکیلوں تک کی بیویاں اس دیہاتی قانون کی خلاف ورزی کی ہمّت نہیں کرتی تھیں کہ بالائی مصر میں — اور خصوصاً کسی گاؤں میں — کوئی عورت سر سے پیر تک برقعے میں ملفوف ہوئے بغیر گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گی۔

خاندان کے وکیل بھی، سرکردہ پڑھے لکھے لوگ بھی اسے اس طرزِعمل سے باز رہنے پر مجبور نہیں کر سکے تھے۔ اس کی آنکھوں میں للکار کی چمک تھی، سرکشی کی مسرت تھی، جبکہ اس کے پتلے، نازک ہونٹوں کے کناروں پر خفیف تمسخر سے ملتی جلتی کوئی چیز کھیلتی رہتی تھی، جیسے وہ — جس کی تعلیم پرائمری اسکول سے آگے نہ بڑھی تھی — ایسی چیزوں سے واقف ہو جن سے واقف ہونے کا کسی اور میں حوصلہ نہیں، اور اپنی اس آگاہی میں ایسی سچائیوں کا سامنا کر رہی ہو جن سے سب لوگ ہمیشہ نظر چراتے رہے ہوں۔ تقریباً بےبس کر دینے والی تکمیل سے تنے ہوئے اپنے بدن کی تیز، چونکتی ہوئی حرکت سے، اپنی بےباک ہنسی سے اور اپنی پُراعتماد اور پُروقار نسوانی چال سے وہ سب کا منہ بند کر دیتی؛ اس میں اسے کوئی لفظ ادا کرنے کی ضرورت نہ پڑتی، صرف اس کی موجودگی، اور اس کی جانداری کی مہک یہ کام کر دیتی۔ دراصل وہ اُن کو خوف اور بےاطمینانی میں مبتلا کر دیتی تھی، جیسے اس نے ان زخموں کو چھُو لیا ہو جو بھر چکنے ہونے کے باوجود ابھی تک حسّاس ہوں اور اس کے لمس سے پھر ہرے ہو جائیں، تقریباً کھل جائیں اور ان لوگوں پر سوچ کی ایسی پُرصعوبت راہوں کے دروازے وا کرتے ہوں جنھیں بند رکھنا ان کی زندگی کی مسلسل جدوجہد رہی تھی۔ لوگوں کی طرف وہ، فرعونوں کے زمانے کے مصر کی کسی بلی کی طرح، تیز، بےپروا، بےتعلق انداز سے نظر ڈالتی تھی، بدن کے افق پر کھلتی ہوئی اس کی کالی آنکھیں بدن کی پوری دنیا کو دیکھتی تھیں اور اس میں کہیں کوئی خرابی نہ دیکھتی تھیں۔ اس کا پورا بدن جو اپنے آپ سے آگاہ تھا اور خوف زدہ نہیں تھا — اصل میں یہی سب میں ان لوگوں کو دہشت زدہ کرتا ہوا وہ خطرہ جھلکتا تھا، اسی لیے وہ اس خطرے کا سامنا ہونے پر اپنی آنکھیں ڈھانپ لیتے تھے، اور —ں سب میں وہ 'رہ بھی موجود تھا جس نے خود اُسے چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا ۔ اُس کی زندگی

Scanned with CamScanner

حدوں تک پہنچنے کی جستجو میں تھا۔

اس کا سبب سے داخلی مخفی تجربہ اب راز نہیں رہا تھا۔ یہ خبر اس کے خاندان تک پہنچ گئی تھی، اور باہر بھی پھیل گئی تھی، کہ اس کا اُس مسلمان کسان سے تعلق ہو گیا ہے جو گاؤں میں ان کی زمینوں پر کام کرتا تھا۔ یہ خبر متواتر اور ضرورساں تھی اور مدی مکھیوں کی طرح لوگوں کے سروں میں بھنبھناتی پھر رہی تھی۔

کیا یہ واقعی درست ہے کہ وہ کسان کبھی کبھی پوری رات اس کے گھر پر گزارتا ہے؟

ناممکن — اور اس کی ماں؟

کیا واقعی اُسے فجر کے وقت سوتے ہوئے قصبے کی تنگ گلی سے نکلتے ہوئے دیکھا گیا تھا؟

اور اس کا کیا سبب ہے کہ وہ گاؤں سے مستقل طور پر قصبے کا چکر لگاتا رہتا ہے اور بار بار اس کے گھر جایا کرتا ہے؟

حساب کتاب کے لیے؟ فصلوں کا حال بتانے کے لیے؟

یہ باتیں کرنے کے لیے وہ خاندان کے بڑوں کے پاس کیوں نہیں جاتا جو درحقیقت ان زمینوں کی دیکھ بھال کے ذمے دار ہیں؟ ان کے لیے اسے اُن دونوں عورتوں کے پاس اُس دور افتادہ، شہتیروں والے مکان میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اور کیا درحقیقت وہ وہاں جاتا بھی ہے جیسا کہ افواہیں مشہور ہو گئی ہیں؟

ماں نے بڑی کم زور، کوشش سے نکلتی ہوئی آواز میں ان افواہوں کے ایک ایک لفظ کی تردید کی لیکن لڑکی یہ باتیں سنتے ہی اپنی گھبرائی ہوئی، اشتعال انگیز ہنسی ہنسنے لگی، اور سارے معاملے کو سرسری سے انداز میں رد کر دیا، ان کے اس الزام کو بےپروائی اور بےاحتیاطی سے ایک طرف کر دیا۔

"بابیا! اٹھ جاؤ بیٹی، دیر ہو رہی ہے۔"

اس نے تکیے پر سے سر اٹھایا اور اس کے گھنے بال اس کے چاروں طرف پھیل گئے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گندمی چہرے کے نازک نقوش کے ساتھ اس کے سر پر ایسے گھنے سیاہ اور سیاہ گھنے بال کہاں سے چلے آئے جن کی وجہ سے وہ قدیم مصر کی کوئی دوشیزہ دکھائی دیتی تھی۔

اس نے کمبل کو اپنے بدن سے جدا کیا اور کمرے کی گرم ہوا کا

Scanned with CamScanner

جھونکا اس کی ٹانگوں کے درمیان چڑھ آیا جو اس کے لمبے شب خوابی کے لباس کے نیچے برہنہ تھیں۔ وہ بدن کو پھرتی سے حرکت دے کر بستر سے اٹھ آئی اور نرم لچک دار انداز میں کھڑی ہو گئی؛ قالین کی کھردری اُون اس کے پیروں کے تلووں کو گدگدا رہی تھی۔ وہ خود پر ایک عجیب، مخصوص انداز میں مسکرائی۔

"ماں، کیا بجا ہے؟"

ہاں، اسے جلدی کرنی ہو گی، کیوں کہ دن کی حدّت ابھی سے اپنے عروج کو پہنچ رہی ہے۔ وہ بہت دیر تک سوتی رہی۔

جب وہ اوپر چھت پر گئی تو بالائی مصر کا آسمان سیسے کی گہری نیلی چادر کی طرح بھاری اور دیر سے منتظر اچانک پن کے ساتھ اس پر آ گرا، برداشت سے باہر۔ اس آسمان کے نیچے ہوا بالکل رکی ہوئی تھی، جیسے اس کی لگام کھینچ لی گئی ہو، جیسے وہ اس آسمان کے وزن کے نیچے حرکت کرنے کی کوشش ہی کے ہاتھوں فنا ہو گئی ہو؛ ہوا اپنا پورا زور لگا کر بھی اس وزن کو اپنے اوپر سے دور کرنے اور ذرا سی حرکت کرنے کے قابل نہ رہی تھی، جیسے کسی کے بازو کے عضلات اپنی پوری قوّت سے کوئی بہت بڑا بوجھ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہوں جس کے بلے انھیں ایک لمحے کے لیے خود کو ڈھیلا چھوڑنے کی مہلت نہ مل رہی ہو۔

وہ حدت اور مشقت کی ایک نہر میں سے گویا بہاؤ کے خلاف راستا بناتی ہوئی، چھت پار کر کے تنور والی کوٹھری تک پہنچی۔

اسے اپنی ماں تنور کے سامنے آلتی پالتی مارے بیٹھی، اس میں لکڑی کے کندے ڈالتی اور اسے روشن کرتی دکھائی دی؛ اس کی حرکات کے پیچھے اس کی چھوٹی سی محدود زندگی کا زور تھا جو لگتا تھا کہ اپنے اندر قید ہو کر رہ گئی ہے۔ اسے دیکھ کر وہ اس نازک جذبے کے ہاتھوں اداس ہو گئی جو اس کے دل کو کسی بہت تیز دھار والے چاقو کی طرح کونچ رہا تھا اور اس میں ایک ناگوار ترحم پیدا کر رہا تھا جو شدید ملامت کے زخم کی طرح محسوس ہوتا تھا۔

لیکن، اس کے باوجود، وہ کوٹھری کے دروازے ہی پر رک گئی اور اپنی ماں سے دور ہی سے سلام دعا کی۔ اس سے یہ ممکن نہیں تھا کہ اپنی ماں کے قریب جا کر اس کے کم زور کندھوں کو اپنے بازوؤں میں لے لے اور اسے بوسہ دے، حالاں کہ اس وقت وہ ایسا کرنے کی خواہش کے ہاتھوں ادھ اٹھا

رہی تھی۔ اسے لوگوں میں ماں بیٹی کے درمیان یہ محبت بھری حرکات عام نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ اسے ان کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے اس نازک جذبے کا پیغام اپنی ماں تک کس طرح پہنچائے جو اس کی روح میں رحم ڈالے دے رہا تھا۔ اس کی ماں اس سے واقف ہوئے بغیر دنیا سے چلی جائے گی۔

وہ مڑی اور آسمان کی بھاری، خارش زدہ لہر میں سے راستا بناتی ہوئی وہیں چلنے لگی جو کسی بہت بڑے بوجھ کے نیچے دبی ہوئی قوّت کی طرح تناؤ کی آخری حد پر تھا۔

جس وقت وہ قصبے کی بڑی سڑک کے کنارے بنے ہوئے پرانے، ایک دوسرے میں گھسے ہوئے مکانوں کے سائے میں، چھڑکاؤ کی ہوئی زمین پر چل رہی تھی تو آسمان کا بوجھ کچھ کم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے اس نے اپنے دل سے اپنی ماں کی محبت کا اور آسمان کا بوجھ ہٹا ہوا محسوس کیا۔ وہ اپنے چھریرے، مضبوط بدن پر تنگ یوروپی وضع کا لباس پہنے، خوش طبعی کے ساتھ، تیز قدموں سے پتلی، پیچ دار گلیاں طے کرتی رہی جن کے کناروں پر بنے ہوئے مکان سر پر جھکے آ رہے تھے۔ اس کا ذہن اپنے سفر کے مقصد پر لگا ہوا تھا۔

پچھلے روز اسے ذکری کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ آج باغ پر پہنچ جائے تاکہ موسم کے پھلوں کا حساب کر سکے اور زمین وغیرہ کے معاملات پر اپنے عم زاد بکرور اور بزرگ شفیق سے بات چیت کر سکے۔

خاندانی زمین پر لگے ہوئے باغ پر جانا ہمیشہ اس کے لیے خوشی اور دلچسپی کی بات ہوتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہاں اس کی بچپن کی آوارہ گردیوں کا جادو ابھی تک باقی ہے۔ اسے یقین تھا کہ آج واپسی پر وہ اپنے ساتھ پھلوں کا تحفہ لا سکے گی اور شاید اسے اپنے اور اپنی ماں کے حصّے کی کچھ رقم بھی مل جائے۔ یہ درست ہے کہ وہ لوگ اس حساب کتاب کے لیے اس کے گھر بھی آ سکتے تھے، لیکن باغ میں گھومنے پھرنے کا خیال، بڑے بڑے پرانے پیڑوں کا ٹھنڈا سایہ، رہٹ سے بل کھا کر آتے ہوئے نالے کے پانی کی گنگناہٹ ۔۔باہر سے آتی ہوئی گھنی ہوا میں کھیلتی ہوئی گنگناہٹ۔ ان سب چیزوں نے اس کے وجود کی گہرائیوں میں پرانے دنوں کی کسک اور آرزو جگا دی اور ساتھ ہی اس کے مبہم سے خوف کا بھی منھ بند کر دیا۔ اگرچہ وہ ان لوگوں سے، جو اس کے رشتےدار تھے، خوف زدہ نہیں تھی، لیکن

ان کی موجودگی میں اسے کچھ اجنبیت سی محسوس ہوتی تھی جیسے ان کے درمیان ایک ہی گہرائی کے خون کا سدھی نہ ہو۔ جیسے وہ یہ تک نہ جانتی ہو کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھا ہو اور ان میں ایک ایسی دنیا کی جھلک نہ پائی ہو جو اس سے بہت دور اور اس کے لیے بند تھی۔ ایسی دنیا جس سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ ان کے طویل، ختم نہ ہونے والے حساب کتاب اور بندھے فصلوں اور ان کی فروخت سے، اور بٹائی اور رہن کے معاملات سے ان کا شغف، اس نے کبھی ان کو سمجھنے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ ان کی یہ تمام فکریں اسے احمقانہ، بےکار کی مشقت معلوم ہوتی تھیں جن کی ذرّہ بھر بھی اہمیت نہیں تھی۔ اسے حساب کتاب کا کام اکتانے اور تھکانے والا لگتا تھا، اور اگرچہ وہ لوگ یقیناً اس کے ساتھ دھوکا کر رہے تھے، اسے اس کی کوئی فکر نہیں تھی، حالاں کہ بلاشبہ ان ماں بیٹی کے لیے ایک ایک پیاستر بہت کام کا تھا۔

اچانک اس نے خود کو نیل کے روبرو پایا۔ وہ سڑک سے اتر کر دریا کے کنارے کنارے اُس گودی کی طرف چلنے لگی جہاں سے اسے کشتی میں بیٹھ کر دریا کے دوسرے کنارے پر اپنی زمینوں اور باغ تک پہنچنا تھا۔ گودی پر افندی طبقے کے کئی لوگ کھڑے تھے؛ ان میں سے ایک نے سیاہ سوٹ اور سر پر طربوش پہن رکھا تھا اور کاغذوں کا ایک پُلندا اٹھا رکھا تھا — شاید وہ عدالت کا ناظر یا انتظامیہ کا کارندہ تھا۔ ان کے علاوہ باقی لوگ تاجر، کاشتکار اور کسان وغیرہ تھے۔ کسانوں میں سے ایک اپنے پیچھے پیچھے اپنی بھینس کو رسی سے کھینچے لیے آ رہا تھا تاکہ اسے دریا پار لے جا سکے۔ وہ سب اس گاؤں کو جا رہے تھے جو اُس کے باغ سے کچھ دور پر واقع تھا۔ دو عورتیں بھی تھیں جن کے بھاری، سیاہ برقعے بھری دوپہر کی گرمی میں بھی ان کے جسموں کے گرد لپٹے ہوئے تھے، اور برقعوں کے اندر وہ سیاہ رنگ کے بھاری کپڑے پہنے تھیں تاکہ کوئی اجنبی نگاہ ان تک نہ پہنچ پائے۔

کشتی آئی تو اس نے اس پر قدم رکھا اور کنارے کے پانی میں آہستہ آہستہ ہچکولے کھاتے ہوئے اس کے تختے کو اپنے پیروں کے نیچے ڈولتا ہوا محسوس کیا۔ اس نے کوشش سے توازن برقرار رکھتے ہوئے اپنے بدن کے نیچے کشتی کے ہچکولوں کو محسوس کیا اور اسے اس خفیف سے خطرے سے لطف آیا جو نیل کے پانیوں پر بہتی سی لیکن سی ہوتی جھجک کی صورت میں بنا رہتا ہے۔

کشتی کے حرکت میں آتے ہی ہوا دریا کے وسیع پھیلاو سے الجھی ہوئی چلنے لگی اور اس کے نیچے پانی پُرسکون وقار کے ساتھ بہتا رہا۔ آسمان کے بوجھ کے پوری طرح دور ہو جانے سے اس پر بہت خفیف، تقریباً غیرمحسوس پست سی چھا گئی جیسے دریا کسی قدیم، دیوتاؤں کی سی طلسمی قوّت کا مالک ہو جس سے کام لے کر لوگوں کے کندھوں کو آسمان کے بوجھ سے آزاد کر دے -- اسے عرصے کے لیے جب تک وہ دریا کے باروؤں میں رہیں، جب تک وہ اپنے آرادکردہ، افق کے سامنے کھلے ہوئے سینوں کو دریا کی ہوا سے بھرتے رہیں اور ان کے اندر آرادی کا وسیع میدان سانس لیتا رہے

چوڑی کشتی نے دریا کے بھرپور بہاو پر سے گزرتے ہوئے جھٹکا کھایا جس پر بھیس نے اچانک نیچے کی طرف جاتے ہوئے اپنا سر اٹھا کر آسمان کے نیچے کی حدّت کی طرف دیکھا، پھر اطمینان سے جگالی کرنے لگی اور اس کے منہ میں سے سفید دودھ جیسا لعاب بہہ کر کشتی کی سطح پر گرنے لگا۔

جب دوسرا کنارہ قریب آیا اور کھجور کے اور دوسرے پیڑوں کے گھنے جھنڈ آہستہ آہستہ بڑے اور زیادہ واضح دکھائی دینے لگے، اس کے دل کو ایک بار پھر خوف جیسی کسی چیز نے جکڑ لیا؛ وہ اپنی مانوس دنیا سے ایک اجنبی زمین پر جا رہی تھی جہاں کے گھنے پیڑ اسے کسی دوسری دنیا سے تعلّق رکھنے والی بھوکی آنکھوں سے گھور رہے تھے اور اپنے اندر اس کے لیے ان جانے خطرے چھپائے ہوئے تھے۔ اسے لگا کہ دریا اسے دوسرے کنارے پر اگل کر اس سے بےسار ہو جائے گا؛ دریا اس سے وہ آرادی، وہ طمانیت اور کشادگی کا وہ احساس واپس لے لے گا جو اس نے عارضی طور پر اسے بخشا تھا، اور ایک بار پھر، بےنگام، اپنی تقدیر کی جانب روانہ ہو جائے گا جو انسانوں کی تقدیر سے مختلف ہے۔

وہ کنارے پر اپنے چھوٹے سے بدن کے ساتھ اتری جو دنیا میں، یا کہیں بھی، اس کی واحد ملکیت تھا؛ اس کا نازک، دھڑکتا ہوا بدن جس نے ایک بار پھر دنیا کو اپنے دائرے میں لے لیا، گھیر لیا، محدود کر دیا۔ اسے اچانک آسمان کے دوبارہ نمودار ہونے اور اپنے پر حاوی ہو جانے کا احساس ہوا۔ طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ باغ کی طرف جانے والے کچّے راستے پر چلتے ہوئے، آسمان کسی بھاری ہاتھ کی طرح اس پر آ پڑا اور اس کے کندھوں پر زور ڈال کر اسے جیسے زمین میں دھنس جانے پر مجبور کرنے لگا۔ ہاں، وہ دیر

سے پہنچی تھی۔ دوپہر کی گرمی شدید ہو گئی تھی، اور ہوا، اپنی سنسناتی ہوئی شدت میں، مکئی کے کھیتوں کے درمیان چکر کھا رہی تھی جو اس کی دونوں طرف کنجان سبزے کی دیواروں کی طرح اٹھے ہوئے تھے اور ان کے اوپر دُھول اڑ رہی تھی۔ زمین اور بھاری آسمان کے درمیان مقید اس دھول بھری ہوا نے تقریباً اس کا دم گھونٹ دیا۔

کسان اپنے زردی مائل مٹیالے چہروں کے ساتھ کچھ دور تک اس کے ساتھ ساتھ چلے آئے؛ ان کی تھرکتی زخمی آنکھیں، جو اپنے اندر تمام اداسی، تمام سکوت، اپنا مفہوم تلاش کرتی ہوئی تمام بدحالی کو سمیٹے ہوئے تھیں، باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں؛ آنکھیں جنھیں کبھی کسی اور شے کی موجودگی کا گمان تک نہیں ہوا تھا؛ وہ ایسی بدحالی تھی جو بہت لمبے عرصے تک جمے رہنے کی وجہ سے غبی پن میں تبدیل ہو گئی تھی، وہ اتنے عرصے سے موجود تھی کہ گویا زندگی کا بنیادی آسرا بن کر رہ گئی تھی۔ اسے ان کی تعاقب کرتی ہوئی نگاہوں کا احساس ہو رہا تھا جن میں ایسی خشک اور سخت افسردگی تھی جس نے الزام رکھنے، سمجھنے یا توجیہہ کرنے کی ہر خواہش کو خیرباد کہہ دیا تھا، جس میں ایک ٹھوس، تھکا دینے والے بوجھ کے سوا کچھ نہ تھا جو ناقابلِ برداشت ہونے کے باوجود ہمیشہ ساتھ رہتا ہے اور ہمیشہ برداشت کیا جاتا ہے؛ اس سے امید کی ذرا سی رمق بھی حاصل نہیں ہوتی کیوں‌کہ یہ ایک خالص اور بےآمیز افسردگی ہے جو اپنی سخت جانی کے سوا ہر چیز سے بےنیاز ہے۔

راستے پر ایک دوراہا آیا تو کسان گاؤں کی طرف مڑ گئے اور اس نے باغ کی سمت جانے والا تنگ راستا لے لیا۔ وہ اب اُن نگاہوں کی زد سے دور تھی جو اس پر یوں پڑتی رہی تھیں جیسے وہ کوئی عجیب جانور ہو، ہر چیز کی طرح ناقابلِ فہم، کیوں‌کہ ان کے اردگرد کی ہر چیز ان کی سمجھ سے باہر تھی، اور انھیں اس بات کی کوئی شکایت بھی نہ تھی، جس طرح اس بوجھ کی کوئی شکایت نہیں تھی جو گویا ان کی زندگیوں کا پیمانہ تھا۔

ہاں، اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تعاقب کرتی ہوئی نگاہیں اس کے لیے اُن دُبلے، زرد، سنولائے ہوئے چہروں سے وابستہ نہیں، اب آسمان کے اس ڈرا دینے والے بوجھ سے اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اس کا بدن بھی نہیں جس کی جان اس شدید گرمی میں پیدل چلنے کی مشقّت نے نکال لی تھی۔ اس کے خون کا دوران سست پڑ

گا تھا اور بہتے ہوئے پسینے پر دھول اڑ اڑ کر چپک گئی تھی اور پسینا اس کی بغلوں کو بھی گیلا کیے دے رہا تھا۔ اس کے اندر ایک خوف تھا، بےشکل سا، غیرواضح، لیکن پھر بھی اس کی آنتوں میں چھوٹی سی سخت گرہ ڈالے دے رہا تھا کبھی گنجان فصلوں کا خوف جن کے درمیان بہت تنگ پگڈنڈیاں تھیں؛ ڈاکوؤں کے جتھوں، قتل و خون اور اغوا اور تاوان کی طلبی کی اُن وارداتوں کا خوف جو کھیتوں کے درمیان کی ان تنگ پگڈنڈیوں پر روز کا معمول تھیں؛ اُن آدمیوں کا خوف جو وہاں گھات لگائے بیٹھے رہتے تھے اور موقع پاتے ہی قدیم، سفاک غصے کے ساتھ، مکمّل انکار کی سرکشی کے ساتھ، اور ہمیشہ کی بندگی سے انکار کرنے والی مایوسی میں زمین اور آسمان کی ساری لگا دینے والے خون کے زور میں اپنے شکار پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

یہ مایوسی اور آدمیوں کی خواہشیں اب بھی وہیں کہیں تھیں۔ وہ انھیں مکئی کی الجھی ہوئی، گردآلود شاخوں سے چمٹا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سیاہ کن، بےقابو خواہشیں آدمیوں کے وجود سے الگ ہو کر دوپہر کی حدت میں گھُل گئی ہوں؛ کبھی سیراب نہ ہونے والی نفسانی، سرکش ہوس، جھپٹ پڑنے اور زیر کرنے کی، لوٹنے اور خون بہانے کی بےلگام وحشی خواہش، روح کے تاریک کونے کھدروں سے اٹھی ہوئی جہاں جانے کا ہر راستا بند ہے؛ جیسے بےجسموں کو الگ آزاد، بےشکل اور سخت جان وجود مل گیا ہو اور وہ دوپہر کی اس حدت کو اپنی دم گھونٹ دینے والی، غرّاتی ہوئی غیرانسانی سانسوں سے معمور کر رہی ہوں۔

اپنے اندر گہرے گڑے ہوئے اس خوف کے اثر میں جب اس نے کھیتوں کی طرف چور آنکھوں سے دیکھا تو اسے اپنا وجود بالکل بےحقیقت اور اپنی نظر میں بےقدر معلوم ہونے لگا۔ وہ اپنی پچھلی ہمّت کے دامن کا سرا تھام کر آگے بڑھتی گئی، جیسے ڈوبتا ہوا شخص سطح پر تیرتی ہوئی لکڑی سے چمٹ جاتا ہے۔

وہ اس خاموش دل گرفتگی کے عالم میں آگے بڑھتی گئی جو کسی کھلی جگہ کو، کسی ہوا کو راہ نہیں دیتی تھی، وہ اس گرم بھاری پن میں سے دقت کے ساتھ اپنا راستا بناتی آگے بڑھتی گئی جو اس کے گزرتے ہی اس کے آگے، پیچھے، ہر طرف سے پھیل کر بند ہو جاتا تھا؛ اسے لگا کہ جب وہ رینگ رینگ کر اس کے وسط میں پہنچے گی تو یہ بھاری پن اسے چاروں طرف سے گھیر لے گا، اسے پہچاننے سے انکار کر دے گا، مسلسل اسے ٹھکراتا اور رد

کرتا رہے گا اور بالآخر اسے مٹا ڈالے گا۔

اچانک، غیر متوقع طور پر اس نے خود کو باغ کی دیوار کے سامنے پایا۔ یوں جیسے وہ دیوار گزرتے وقت سے متاثر نہ ہونے والی پتھر کی ستون جیسے اس کے سامنے گرد آلود راستے سے اٹھ کر اچانک آن میں بند ہو گئی ہو۔ باغ بہت زمانے پہلے دست بہ دست اس کے خاندان تک پہنچا تھا۔ شاید اس نے کسی بڑھے نے اسے بہت پہلے کسی بڑے جاگیردار سے خریدا تھا۔ ابھری ہوئی زمین کی سطح پر تک ہوا اور اس اونچی ٹھوس دیوار سے گھرا ہوا، وسیع و عریض قدیم اور پھرا پُرا باغ پورے خاندان کے لیے عزت اور فخر کا سرمایہ تھا۔

اس نے پرانے چوبی دروازے کا پٹ بند کیا تو وہ ایسے زنگ لگے مضبوط پر جھول کر چرچرایا۔ اس کے قدم تنگ اور دم گھونٹنے والی پگڈنڈی کی زمین کو چھوڑ کر گھنے سرسبز اور مضبوط پیڑوں کے سائے میں سے ہوتی چوڑی روش پر جیسے تکے جس کی دونوں جانب گھاس لگی ہوئی تھی۔

دور تک پھیلا ہوا باغ خاموش اور سنسان تھا۔ اس کے آخری کونے میں پیڑوں کے اونچے گھنے تنوں کے درمیان سے دیوار کے پُرانے پتھر یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کسی ان کہے، پُراسرار پیغام کا اشارہ دے رہے ہوں۔ یک دم گھنی جھاڑیوں میں سے کسی کوّے کی آواز آسمان میں بلند ہوئی اور اس کے بعد پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی۔

اس نے اردگرد کے پھیلاؤ پر نظر ڈالی اور باغ کے کونے میں بنے ہوئے کمرے کی طرف بڑھتی گئی۔ وہ خود کو دنیا میں تنہا محسوس کر رہی تھی تنہا، کسی خوف، کسی [illegible] کسی خواہش کے بغیر۔ بالکل تنہا جیسے زمین کی سطح پر ابھی تک کسی انسان کے قدم نہ پڑے ہوں، جیسے انسان محض گمان ہو جو ابھی جنم میں بھی نہ آیا ہو ایسا عنصر جو ذہن کے لیے جیسے غیر متعلق ہو۔

تنہائی میں [illegible] سکوت، جس سے ایک خاص طرح کی گرد آلود گرمی [illegible] سی بھی روشن جو یوں سی ہوتی تھی جیسے چلنے کے لیے نہ بنائی گئی ہوں [illegible] گھومتا ہو رفتہ آنکھوں پر پٹی باندھے اس کے گرد [illegible] سے بندھا ہوا ہو جیسے وہ کسی کے عمل کے بغیر خودبخود وجود میں آ گیا ہو اور اس بند دائرے میں چکر کاٹنے لگا ہو۔

کمرے کی طرف جاتے ہوئے اسے یوں جیسے کوئی [illegible] محسوس

Scanned with CamScanner

ہوئی؛ اس وسیع و عریض باغ پر مسلط اور اطمینان کا سا احساس ہوا جو ازل سے سنسان پڑا تھا، قدیم پیڑوں اور ان کے تنوں کی گانٹھوں، چوڑی کچی روشوں، ناہموار میدان، مٹی کے ٹیلوں، ناز کے اونچے، خم دار درختوں، دور کے نیلے فطری آسمان اور اس دیوار سمیت، جس پر آ کر ہر چیز ختم ہو جاتی تھی۔

وہ مڑی اور راستے پر چلتے ہوئے ۔۔گویا وہ اس کا حصہ نہ ہو۔۔ کمرے کی طرف بڑھتی گئی جہاں اس کے رشتے‌دار اس کے منتظر تھے۔

شکور، اس کا سگا عم زاد، اس سے دس برس بڑا تھا؛ وہ اس بات کو جانتی تھی اور اسے ذہن میں رکھتی تھی جیسے یہ کوئی فخر کی بات ہو کوئی ایسا رشتہ ہو جو انھیں ایک دوسرے سے وابستہ کرتا ہو۔ اس کا جسم بہت مضبوط اور طاقت ور تھا، جلد شان دار گندمی رنگت کی تھی اور چہرے کے نقوش سے بےباکی اور سختی ظاہر ہوتی تھی؛ اس کی آنکھوں میں خوداعتمادی اور اصرار کی چمک تھی؛ قد لمبا اور بےعیب تھا۔ وہ خاندان کے مردوں میں سب سے ممتاز اور وجیہ لگتا تھا۔ ان میں وہ واحد مرد تھا جس نے اس کی صورت حال کی بابت اس سے کبھی ایک لفظ تک نہ کہا تھا نہ کوئی سوال کیا تھا نہ نصیحت نہ ملامت کی تھی۔ ان میں سب سے کم گو ہونے کے باوجود وہی تھا جو چھا جانے والی خنجر کر دینے والی نگاہوں کے ذریعے سے اس کو سب سے بڑھ کر ملامت کرتا تھا۔ وہی تھا جس کا سامنا ہونے پر خوف کا اور ساتھ ہی بےپناہ محبت کا احساس اس کے بدن میں سرایت کرنے لگتا تھا۔

جہاں تک شفیق کا تعلق ہے وہ چند سال پہلے یونیورسٹی سے لوٹا تھا۔ اس نے یورپی لباس پہننا ترک کر دیا تھا اور اپنے گھر اپنی زمینوں اور اپنے کھیت‌دار خاندان میں سکون پا لیا تھا۔ اس کی کمر کے گرد اور ٹھوڑی کے نیچے فربہی کے آثار نمودار ہو گئے تھے جس نے اس کی شخصیت میں کچھ زنانہ پن پیدا کر دیا تھا۔ اس کے گورے بھرےبھرے چہرے کے خطوط ذرا لٹک آئے تھے اور ان میں سے اس کی چھوٹی چھوٹی خمارآلود آنکھیں چمکتی تھیں۔ بابت نے ہمیشہ محسوس کیا تھا جیسے اس کی آنکھیں اسے بےلباس کر رہی ہیں اس کی خواہش کر رہی ہیں، اس کے گرد چکر کاٹ رہی ہیں، اس کے بدن کی سطح کے آس پاس بھٹک رہی ہیں، لیکن اسے چھونے یا اس میں داخل ہونے کی ہمت نہیں کر پا رہیں۔ وہ دونوں تقریباً ہم عمر تھے اور بچپن

میں اس کے قاہرہ جانے سے پہلے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔ مگر پھر اس نے اس ذہنی سوکھی عورت سے شادی کر لی تھی اور ہنیہ کو اس کے عمر رسیدہ شوہر کے واسطے چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے بڑے سے مکان میں اپنے لیے سکون اور آسائش کا پورا انتظام کر رکھا تھا؛ اس کی راتیں شراب نوشی میں گزرتی تھیں جو صبح ہونے تک جاری رہتی تھی۔ جب کبھی ہنیہ کا ذکر ہوتا اس کا مزاج بگڑ جاتا اور وہ اسے گالیاں اور دھمکیاں دینے لگتا۔

تیسرا شخص ذکری تھا۔ وہ خاندان کا حقیقی سربراہ تھا، سب مردوں سے عمر میں بڑا۔ وہ مسلسل مصروف رہتا تھا؛ کبھی آدمیوں کو کام پر رکھتا کبھی بٹائی کے موسمی ٹھیکے دیتا کبھی دوسروں کے بندوبست اور بانٹی کے کام لیتا، ہمیشہ مصروف ہمیشہ زمین پر بھاری قدم رکھتا ہوا۔ پست قد اور فربہ جسم کے باوجود اس کی مضبوط شخصیت کا احترام کیا جاتا تھا اور اس کی سرگرمی میں کوئی فرق واقع نہ ہوتا تھا؛ اس کی بھاری، گونج دار آواز میں ذہانت کی گہرائی محسوس ہوتی تھی اور اپنے منافع اور مفاد کو دیکھنے میں اس کی آنکھیں کبھی خطا نہ کرتی تھیں۔ وہی تھا جو ہانیہ سے سب سے زیادہ نرمی سے بات کرتا تھا؛ اسے نصیحت کرتے ہوئے اس کی آواز میں پدرانہ شفقت ہوتی اور وہ اسے لوگوں کی پھیلائی ہوئی افواہوں اور خاندان کی شہرت پر ان سے پڑنے والے اثرات کا خیال کرنے کی تاکید کرتا۔ اس کی گفتگو میں یسوع کا نام، آباواجداد کا ذکر، قبطیوں کا مقام، سب کچھ پرویا ہوا ہوتا تھا اور یہ سب جھنڈے اس کی بھاری آواز کے اوپر پھڑپھڑاتے رہتے اور اس کے لفظ رفتہ رفتہ اکتاہٹ اور بےتمتّی کا شکار ہو جاتے۔

ان سبوں کو اسے اپنے اپنے تعلق سے موسم کی فصل کا حساب دینا تھا۔ ہاں وہ حساب شام کو جلدی سے نمٹا لے گی اور چند انار اور کھجوروں کے کچھ گچھے لے کر باہر نکل آئے گی اور پھر اکیلی باغ میں گھومتی اور سہ پہر کی ہوا کا لطف اٹھاتی رہے گی۔

اسے اس بات پر ہلکی بہت ہلکی سی حیرت ہوئی کہ اس نے آج تک اس کمرے کی موجودگی کو محسوس نہیں کیا تھا جس کی لکڑی کی شکستہ سجی دیواریں کھجور کی سوکھی شاخوں، چٹائیوں اور کپاس کے ڈنٹھلوں سے ڈھکی ہوئی اس وقت اس کے سامنے تھیں۔ اس نے کبھی خیال نہیں کیا تھا کہ یہ ٹوٹی پھوٹی دیواریں کسی کمرے کی ہو سکتی ہیں۔

آسمان کی طرف فخر سے بلند ہوتے ہوئے پیڑ اور ازل سے صنوبر گھومتا ہوا خاموش ریشہ، وہ باغ کی ان سب نعمتوں پر نظر ڈالے بغیر، انہیں اپنے پیچھے چھوڑ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔

جوں ہی اس نے اندر قدم رکھا ایک منتشر سی افسردگی نے، جس میں متلی اور سنسنانے کی بُو ملی جلی تھی، اسے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

اسی خاکی اور نم افسردگی کی حالت میں اس نے اپنے سامنے ان تین عجیب نما انسانوں کو کھڑے دیکھا اور اچانک منجمد ہو گئی۔ حرکت کرنے، یہاں تک کہ ایک قدم آگے رکھنے کی قوت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑی تھی اور اپنے اوپر تمام اختیار کھو چکی تھی؛ اس وقت بھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے خود پر دور سے نظر ڈال رہی ہو۔

ان تینوں پر ایک بے حد مہیب سنجیدگی طاری تھی جو مہلک، حتمی اور ناقابل فرار معلوم ہوتی تھی: شبیہ کے بھاری، پسینے سے تر چہرے پر چمکتی ہوئی آنکھیں، گویا بہت طویل انتظار کے بعد، اس کے بدن کو تاراج کر رہی تھیں۔ ذکری دور کونے میں کھڑا یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اس وسیع، قدیم اور مضبوط عمارت کا پشت کا مینار ہو جو اس وقت اس کے سامنے تھی اور جس میں اس کا داخل ہونا لازم تھا۔ بکتور، گویا اس عمارت کا مرکزی ستون، ان دونوں کے درمیان کسی عجلت کے بغیر کھڑا تھا اور اپنے بازو کی طویل، سست حرکت سے اپنا سگریٹ زمین پر گرا رہا تھا۔ اس کا لمبا قد کسی قدیم کلیسا کے نوعمر، طاقت ور راہب کی طرح ایستادہ تھا اور گندمی چہرے پر مذہبی جنگ جوئی جیسا مقدس عزم جھلک رہا تھا۔ اس پر مصلے کی سنگینی اور ناگزیریت کی ایسی مہیب پرچھائیں تھی کہ اس سے فرار کا خیال بھی ہانیہ کے ذہن میں نہ آ سکتا تھا کیوں کہ اس نے بغیر کسی کشمکش کے مزاحمت کی تمام قوت کو سلب کر کے اس کی ذات کے اس حصے پر حتمی غلبہ پا لیا تھا جسے وہ ابتدا سے اپنی ملکیت سمجھتی آئی تھی۔

اس کی آواز ایک عجیب مدھم روشنی سے پارہ پارہ ہوتی ہوئی اس افسردگی کے کنارے سے، گویا کسی خواب میں، ہانیہ تک پہنچی:

"یہاں آؤ، ہانیہ۔"

وہ نہ اپنا منہ کھول سکی اور نہ قدم بڑھا سکی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی بھی لمحے زمین پر ڈھیر ہو جائے گی۔ اس کی تمام ہمت خواب

دے گئی جسے وہ تھی۔ وہ پُراعتماد بےپروا لڑکی بھی نہیں تھی جو قصبے میں سب لوگوں کی مخالفت کے باوجود اپنے راستے پر بڑھتی چلی جاتی تھی لیکن وہ کڑی تھیں، اور زمین پر گر پڑنے کے بعد شدید انتظار نے اس پر خوف طاری کر کے ہر دوسرے خیال کو معدوم کر دیا۔ مگر لمحے گزرتے رہے، وہ اس انتظار کے سرے پر کھڑی کپکپاتی رہی اور اس بات نے اس کی جان نکال کر اسے کچھ بھی کر پانے کی قوت سے محروم کر دیا۔

اس نے بکھور کو لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کے قدم اٹھانے کے انداز میں کسی عجلت کا نشان نہ تھا لیکن اس سے ایک مضبوط عزم کا اظہار ہو رہا تھا۔ پہلے تو اس کے چہرے کے خدوخال کو اچانک اپنی آنکھوں کے بالکل قریب محسوس کیا، وہ چہرہ اصل سے بڑا لگتا تھا، معدوم ہو رہا تھا اور اس کی سرنگاہ بےحد گہری تھی۔ اسے اپنے بدن میں ایک بےبس حرکت کا احساس ہوا اور پھر دو ہاتھوں نے اس کے ہاتھوں کو گرفت میں لے لیا، دو ہاتھوں نے اس کا منہ بند کر دیا، دو ہاتھوں نے اس کی گردن جکڑ لی، پھر اس کا چہرہ ایک طرف اور سینے پر رگڑ کھانے لگا، اس کے ہونٹ ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے اور دو ہاتھوں نے اس کے پیروں کو بند میں کر کے اسے ان تین مردانہ جسموں کے درمیان زمین سے اٹھا کر ہوا میں بند کر دیا۔ اس کا بدن مضبوط ہاتھوں اور انگلیوں کے جال میں پھڑپھڑانے لگی۔ پتلونوں کی قمیضیں اس کے اعصاب کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے لگیں۔ بازوؤں اور جسموں کی دیواروں نے چاروں طرف سے اسے بھینچنا شروع کر دیا۔

تب اس خوف لمحے پر آ کر اس کے بدن میں چکر کاٹتی ہوئی وہ گرہ ذہنی سی ہو کر کھل گئی اور اس کے اندر سے زندہ رہنے کی بےتاب آرزو ایک روشن جھپٹ دینے والے جنونی شعلے کی صورت میں بھڑک اٹھی۔ یہ وجود کو برقرار رکھنے، اپنے بدن پر اختیار قائم رکھنے کی آرزو تھی جو اس وقت سات بےرحم ہاتھوں کے شکنجے میں تھا۔ اس کے بدن نے بےقرار لاوے کی شدت اختیار کر لی جو ان مردوں کے سینوں سے ٹکرا ٹکرا کر ان زندہ ہاتھوں اور بازوؤں سے رہا ہونے کی جدوجہد کرنے لگا۔ اس نے بےخبر کہ فرار کی نہ طاقت اور خواہش، آزاد ہونے کی بےتابی ان بازوؤں اور جسموں کی قید سے فرار ہو کر کھلے آسمان تلے پہنچنے کی یہ شدید آرزو کس مقام سے پھوٹی تھی۔

مرد کی آواز جو اپنی چیخ سے پوری رات کو بھر دینا چاہتی تھی اس

کے گلے میں محض ایک گھٹی ہوئی منمناہٹ کی شکل میں پیدا ہوئی۔ اس کے ہاتھ دکری کے ہاتھوں کی گرفت میں ٹوٹے جا رہے تھے جو اس کی پشت کو اپنے پیٹ کے زور سے دبا کر قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ اب اس کے گلے پر فولادی انگلیوں کا بڑھتا ہوا بھیانک دباؤ پڑنے لگا اور اس کی آنکھوں کے بالکل پاس بکور کے چہرے کے وحشی نقوش اینٹھ کر سیاہ پڑنے لگے۔ بکور کے چہرے کی رگیں کھنچ کر ابھر آئی تھیں اور اس کے پورے جسم کے شدید زور نے اسے کسی غیرانسانی چہرے میں منقلب کر دیا تھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گویا دنیابھر کے، تمام زمانوں کے تمام انسانوں کو اپنے دباؤ سے بےجان کرنے میں مصروف تھیں۔ وہ ہر لمحے نائب کی سانس کی نالی پر سخت ہو رہی تھیں، ان کی طاقت ہر لمحے بڑھتی جا رہی تھی اور دباؤ میں ہر لمحے اضافہ ہو رہا تھا۔ اچانک نائب کو اپنی ہوا میں بلند برہنہ ٹانگوں کے درمیان کسی کے قدم رکھنے کا احساس ہوا اور پھر کسی کے دو ہاتھوں نے اس کے کندھوں کو سختی سے جکڑ لیا اور ان کی سختی اس پر کسی اجنبی اور مہلک شئے کی طرح چھانے لگی۔ اس کا بدن، جیسے وہ اپنی پوری جان کے زور سے اس قید سے رہا کر کے باہر آسمان تلے لے جانا چاہتی تھی، ایک دوسرے جسم کے قابض دباؤ سے نڈھال ہو کر ڈھیلا پڑتا جا رہا تھا۔ خود کو اس دوسرے جسم کے سپرد کرتا چلا جا رہا تھا جس کی نگاہیں اسے بےلباس کرتی رہی تھیں۔

اس کے باوجود وہ چلّا رہی تھی، اگرچہ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ ایک بےآواز چیخ جس نے پوری دنیا کو اپنی سرکشی سے تہ و بالا کر دیا اور اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنی بھنچی ہوئی مٹھیوں سے وہ پتھر کی ان دیواروں پر ضربیں لگاتی رہی جو اسے نکلنے کی راہ نہیں دے رہی تھیں اور باہر کی کھلی ہوا سے ہم آغوش ہونے کی خواہش کے راستے میں کھڑی تھیں۔ اس کے پیر کبھی ہار نہ ماننے والی ضد سے باربار زمین پر ٹھوکریں مارتے رہے۔

مردوں نے اس کے جسد کو زمین پر گر جانے دیا اور خود کھلی ہوا میں سانس لینے اور بند اور بےستار آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر سگریٹ پینے کی غرض سے باہر نکل آئے۔

٢

طيّب صالح
نبيل جورجي
محمد خضيّر
غسّان كنفاني

طیّب صالح (Tayeb Salih)

طیب صالح (جو اپنا نام الطیب صالح لکھنا پسند کرتے ہیں) ۱۹۲۹ میں شمالی سوڈان کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے جو ان کی اکثر تحریروں کا محل وقوع ہے۔ خرطوم یونیورسٹی میں تعلیم پانے کے بعد وہ انگلستان چلے گئے اور وہاں اپنی تعلیم جاری رکھی۔ ان کی پیشہ ورانہ زندگی زیادہ تر بی بی سی کی عربی سروس سے وابستہ رہ کر گزری۔ بعد میں انہوں نے قطر میں محکمۂ اطلاعات کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ اب وہ پیرس میں یونیسکو سے منسلک ہیں۔ وہ عربی فکشن نگاروں میں بہت ممتاز مقام رکھتے ہیں اور ان کی بہت سی تحریروں کا ترجمہ مختلف زبانوں میں ہو چکا ہے۔

نبیل جورجی (Nabil Gorgy)

نبیل جورجی ۱۹۴۴ میں قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ قاہرہ یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی اور بعد میں نیویارک میں انجینئر کے طور پر کام کرتے رہے۔ اب وہ واپس قاہرہ میں رہ رہے ہیں اور لکھنے کے علاوہ اپنی آرٹ گیلری چلانے میں مشغول ہیں۔ قدیم مصری موضوعات، مناظر اور تصوف کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے کہانیوں کے علاوہ ناول بھی لکھے ہیں۔

محمّد خضیّر (Mohammed Khudayyir)

محمد خضیر ۱۹۴۰ میں جنوبی عراق میں بصرے کے قریب پیدا ہوئے اور وہیں رہتے ہیں اور ایک سکول میں پڑھاتے ہیں۔ اگرچہ ۱۹۸۲ تک ان کی کہانیوں کے صرف دو مجموعے شائع ہوئے تھے لیکن ان کو عربی فکشن کے جدید لکھنے والوں میں نہایت اوریجنل سمجھا جاتا ہے۔

غسّان کنفانی (Ghassan Kanafani)

غسان کنفانی ۱۹۳۶ میں فلسطین کے مقام عکرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۲ میں بیروت میں اپنی کار میں رکھے گئے بم کے دھماکے میں ہلاک ہو گئے۔ آزادیٔ فلسطین کے عوامی محاذ (PFLP) کے ترجمان کے طور پر بیروت منتقل ہونے سے پہلے انہوں نے دمشق اور کویت میں صحافی اور مدرس کے طور پر کام کیا۔ موجودہ انتخاب میں شامل ان کی کہانی کا محور و موضوع کویت ہی ہے۔ سیاست سے اپنی گہری وابستگی کے باوجود انہوں نے فلسطین کے ادیبوں میں ممتاز مقام حاصل کیا۔ ان کے پانچ ناول اور کہانیوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔

Scanned with CamScanner

طیّب صالح

انگریزی سے ترجمہ : اجمل کمال

قبرصی

جولائی میں نکوسیا یوں لگ رہا تھا جیسے حرضوم کو اکھاڑ کر دمشق میں بسا دیا گیا ہو۔ انگریزوں کی بچھائی ہوئی سڑکیں خوب چوڑی تھیں، صحرا حرضوم سا تھا، لیکن مشرقی اور مغربی ہواؤں میں وہی کشمکش تھی جو مجھے دمشق کی یاد دلاتی تھی۔

یہ مقام سر سے پیر تک برطانوی تھا، اس خون کے باوجود جو یہاں بہہ چکا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کیوں کہ میں یونانی کردار والے کسی شہر کی توقع کر رہا تھا۔ مگر اس آدمی نے مجھے اتنی دیر تک اپنے جذبوں کا تعاقب کرنے کی مہلت نہ دی کہ کسی نتیجے تک پہنچ سکوں؛ وہ آیا اور سوئمنگ پول کے کنارے پر میرے برابر میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور اس کے لیے قہوے کی پیالی آ گئی۔

"ٹورسٹ؟" وہ بولا۔

"ہاں۔"

اس نے عجیب سی وار بکالی جس کی معنویت میں نہ سمجھ سکا۔ وہ گویا یہ کہہ رہا معلوم ہوتا تھا کہ مجھ جیسے لوگ نکوسیا میں سیاح کی حیثیت سے آنے کے مستحق نہیں یا پھر یہ کہ نکوسیا اس کا مستحق نہیں کہ

مجھ جیسے لوگ یہاں سیاحت کی غرض سے آئیں۔

میں نے اپنی توجہ اس پر سے ہٹا لی اور ایک عورت کو دیکھنے لگا جس کا چہرہ رافیل کے فرشتوں سے مشابہ تھا اور بدن گوگیں کی تصویروں کی عورتوں جیسا۔ کیا یہ بیوی ہے یا دوسری عورت؟ ایک دم پھر اس نے میرے خیالوں کا سلسلہ توڑ دیا۔

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"سوڈان کا۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"سرکاری ملازمت۔"

میں نے کہا کیونکہ درحقیقت میں حکومت کا ملازم نہیں تھا۔ بہرکیف، حکومتوں کے کندھے بہت چوڑے ہوتے ہیں۔

"میں کوئی کام نہیں کرتا،" وہ بولا۔ "میں ایک کارخانے کا مالک ہوں۔"

"اچھا؟"

"عورتوں کے لباس بنانے کا کارخانہ ہے۔"

"کیا بات ہے؟"

"میں نے بہت پیسہ بنایا ہے۔ حبشیوں کی طرح کام کیا ہے۔ خوب دولت کمائی ہے۔ اب میں کام نہیں کرتا ... سارا وقت بستر میں گزارتا ہوں۔"

"سو کر؟"

"مذاق کر رہے ہو؟ مرد بستر میں کیا کرتا ہے؟"

"تم تھکتے نہیں؟"

"مذاق کر رہے ہو۔ ذرا مجھے دیکھو ... کیا عمر ہو گی میری؟"

کبھی پچاس کا لگتا تھا، کبھی ستر کا۔ مگر میں اس کی ہمت افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ستر،" میں نے اس سے کہا۔

میرے مفروضے کے برخلاف اسے صدمہ نہیں پہنچا۔ اس نے ایک گونج دار قہقہہ لگایا اور بولا:

"درحقیقت پچھتر سال۔ مگر کوئی شخص مجھے پچاس سے زیادہ کا نہیں سمجھتا۔ سچ سچ کہو۔"

"ٹھیک ہے، پچاس۔"

"تمھارے خیال میں اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"کسرت۔"

"ہاں، بستر میں۔ یہی کام ہے -- کالی اور گوری، لال اور پیلی سب رنگ۔ یوروپی، نیگرو، انڈین، عرب، یہودیہ! مسلمان، عیسائی، بدھسٹ سارے مذہب۔"

"بہت لبرل معلوم ہوتے ہو۔"

"ہاں، بستر میں۔"

"اور بستر سے باہر؟"

"مجھے یہودیوں سے نفرت ہے۔"

"کیوں نفرت ہے؟"

"بس یوں ہی۔ وہ کھیلتے بھی مہارت سے ہیں۔"

"کیا؟"

"موت کا کھیل۔ صدیوں سے کھیل رہے ہیں۔"

"اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے؟"

"کیونکہ میں--- کیونکہ میں--- اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"کیا انہیں شکست نہیں ہوتی؟"

"آخر میں سب ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔"

"اور ان کی عورتیں؟"

"بستر میں ان سے بہتر کوئی نہیں۔ ان سے جنسی شدید تعرب ہو، ان کی عورتوں کے ساتھ اتنا ہی مزہ آتا ہے وہ میرے محبوب لوگ ہیں۔"

"اور امریکی حبشنیں؟"

"ان سے میرا تعلق ابھی تعرب کی حد کو نہیں پہنچا۔ مجھے ان پر اور توجہ دینی ہو گی۔"

"اور عرب؟"

"ان پر ہنسی آتی ہے یا رحم۔ آسانی سے ہار مان لیتے ہیں، کم از کم آج کل۔ ان کے ساتھ کھیلنے میں لطف نہیں، کھیل یک طرفہ رہتا ہے۔"

مجھے خیال آیا، کاش انہوں نے قبرص کو قبول کر لیا ہوتا، کاش بانھور میں ان سے امن کا وعدہ کر لیا گیا ہوتا۔

قبرصی نے پھر ایک کوبچ دار قہقہہ لگایا اور کہا:

"عورتیں مرد کی عمر بڑھاتی ہیں۔ آدمی کو اپنی عمر سے کم از کم دس سال کم نظر آنا چاہیے۔ چانک دسی اسی کو کہتے ہیں۔"

"کیا تم موت کو فریب دیتے ہو؟"

"موت کب ہے؟ اچانک سے مل جانے والا ایک شخص جو تمہارے برابر میں آ کر بیٹھ جائے، جیسے اس وقت میں بیٹھا ہوں، تم سے بے تکلف بات کرے، مثلاً عورتوں کے بارے میں یا اسٹاک ایکسچینج کے بارے میں۔ پھر تمہیں احترام کے ساتھ دروازے تک لے جائے۔ دروازہ کھول کر تمہیں باہر جانے کا اشارہ کرے۔ اس کے بعد کیا تمہیں کچھ خبر؟"

* * *

ایک مثالا بادل کچھ دیر اوپر رکا رہا، مگر اس لمحے مجھے خبر نہ تھی کہ جدائی سر چھوڑا جا چکی ہے اور قبرصی میرے ساتھ ایک خطرناک کھیل کھیل رہا ہے۔

ہنسی کی لہر نے پھیل کر مجھے گھیر لیا۔ وہ ایک حسین خاندان تھا جو آ کر بیٹھتے ہی مجھے پسند آ گیا۔ باپ جس کا چہرہ ایک طلسمی کا اظہار کرتا تھا۔ ماں جس کی بربطانوی آواز کسی قدیم بربط کے تاروں پر چھیڑی ہوئی کوئی الوہی گت تھی، اور چار بیٹیاں، جن میں سب سے بڑی بارہ سال سے زیادہ کی نہ تھی، جو چہکتی لگتی، ماں باپ کو چھیڑتی، سوئمنگ پُول میں آ جا رہی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور اپنی مسرت کا دائرہ اتنا وسیع کر دیتے کہ میں بھی اس کے محیط میں آ جاتا۔ ایک لمحہ ایسا آیا جب مجھے باپ کے قہقہے سے معلوم ہوا کہ وہ مجھے مدعو کرنے کو ہے! عین اسی لمحے قبرصی مجھ پر بازی لے گیا۔ بڑی لڑکی اٹھی اور وقار سے قدم رکھتی ہوئی پُول کی طرف جانے لگی۔ پھر وہ ایک دم رکی جیسے کسی پراسرار قوت نے اسے جکڑ لیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی قبرصی بولا،

"اس کے لیے میں سو پاؤنڈ اسٹرلنگ دینے کو تیار ہوں۔"

"کس لیے؟" میں نے چونک کر اس سے کہا۔

قبرصی نے اپنے بازو سے ایک فحش اشارہ کیا۔

اسی لمحے لڑکی منہ کے بل پتھر پر گری اور اس کی پیشانی سے خون بہنے لگا۔ ایک دم خاندان ڈرے ہوئے پرندوں کی طرح بکھرا مڑ کر اٹھا اور لڑکی کے گرد جمع ہو گیا۔ میں اس شخص کے پہلو سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس سے شدید نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اور اس سے بہت دور میں میز پر جا بیٹھا۔ مجھے بیٹیاں اور ان کی ماں یاد آئیں جو بیروت

میں نہیں، اور میں طیش میں آ گیا۔ میں نے مسرور خاندان کو اداسی سے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا، لڑکیاں ماں سے لپٹی ہوئی تھیں ماں باپ کو ملامت کر رہی تھی، اور میرا غصہ اور شدید ہو گیا۔ پھر رفتہ رفتہ میں پُرسکون ہو گیا اور میرے اردگرد کی سب چیزیں پُرسکون ہو گئیں۔ شوروشغب تھم گیا اور میرا دوست طاہر ود رواسی آ کر میرے پاس بیٹھ گیا، سعد کی دکان کے سامنے پڑی ہوئی بنچ پر۔ اس کا چہرہ دمک رہا تھا، تندرستی اور توانائی سے بھرپور۔

"وہی، یہ کیا بات ہے؟" میں نے اس سے کہا، "کہ تم نہ بوڑھے ہوئے ہو اور نہ کم زور، حالاں کہ تمھاری عمر ان سب سے زیادہ ہے؟"

"جب سے مجھے دنیا کا شعور ہوا ہے،" وہ بولا، "میں متواتر حرکت میں ہوں، مجھے یاد نہیں کہ میں کبھی کسی مقام پر ٹھہرا ہوں۔ میں گھوڑوں کی طرح کام کرتا ہوں، اور جب کرنے کو کچھ نہیں ہوتا تو خود کو مصروف رکھنے کے لیے کام ایجاد کر لیتا ہوں۔ میں کسی بھی وقت سوتا ہوں، جلدی یا دیر سے، مگر مؤذن کی آواز آتے ہی فجر کی نماز کے لیے جاگ اٹھتا ہوں۔"

"مگر نماز تو تم نہیں پڑھتے؟"

"میں اذان ختم ہوتے ہی کلمہ پڑھ کر استغفار کر لیتا ہوں اور میرے دل کو سکون ہو جاتا ہے کہ دنیا ہمیشہ کی طرح چل رہی ہے۔ پھر میں کوئی آدھ گھنٹے کو سو جاتا ہوں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اذان کے بعد کی آدھ گھنٹے کی جھپکی میرے لیے رات بھر کی نیند کے برابر ہوتی ہے۔ پھر میں یوں جاگ اٹھتا ہوں جیسے الارم کی آواز سے آنکھ کھلی ہو۔ میں چائے بنا کر فاطمہ کو جگاتا ہوں۔ وہ فجر کی نماز پڑھتی ہے۔ پھر ہم چائے پیتے ہیں۔ میں نیل کی سطح پر سورج کی کرنوں سے ملاقات کو جاتا ہوں اور خدا کی صبح کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں کتنی دیر بھی باہر رہوں، ناشتے کے وقت واپس آ جاتا ہوں۔ ہم ناشتے کے لیے بیٹھ جاتے ہیں، میں اور فاطمہ اور خدا کے خادموں میں سے کوئی بھی جو قسمت کی مہربانی سے ہمارے ہاں مہمان ہو۔ پچاس سال سے یہی معمول ہے۔"

کسی روز میں طاہر ود رواسی سے محجوب کی چار بیویوں میں سے ایک فاطمہ بنت جبرالدار سے اس کی شادی کا قصہ دریافت کروں گا۔ وہ اپنی ذات کا بھی اتنا وفادار نہیں تھا جتنا محجوب کا۔ کہ وہ سورماؤں کی سی نام وری حاصل کر لے گا؟ ۔ بات واضح تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو وہ

محجوب کے لیے خود کو بھی قربان کر دے گا۔ کیا میں اس سے ابھی پوچھ لوں؟ مگر، اس نے خود ہی ایک چھوٹا سا فقرہ کہہ دیا جو اس کی تمام زندگی کے تانے بانے کا خلاصہ تھا:

"فاطمہ بنت جبرالدّار -- واللہ کیا لڑکی ہے؟"

"اور محجوب؟"

طاہر ود روّاسی نے قہقہہ لگایا جس میں انھیں گزرے ہوئے دنوں کی مہک تھی؛ اس سے اس کی محجوب سے محبّت کا اشارہ ملتا تھا۔ اس کا نام سن کر ہی وہ مسرت سے مغلوب ہو جاتا، جیسے اس کے نزدیک دنیا میں محجوب کی محض موجودگی ہی اسے کم کشمکش اور بہتر بنانے کے لیے کافی ہو۔ وہ ہنسا اور ہنستے ہنستے بولا:

"محجوب کی بات ہی اور ہے؛ محجوب کسی اور مٹی کا بنا ہوا ہے۔"

پھر وہ خاموش ہو گیا اور مجھ پر واضح ہو گیا کہ اس وقت وہ اس موضوع پر کچھ اور نہیں کہنا چاہتا۔ کچھ وقفے کے بعد میں نے اس سے پوچھا:

"عبدالحفیظ کا کہنا تھا کہ تم نے زندگی میں ایک بار بھی مسجد میں قدم نہیں رکھا۔ کیا یہ درست ہے؟"

"صرف ایک بار میں ایک مسجد میں داخل ہوا تھا۔"

"کیوں؟ کس لیے؟"

"صرف ایک بار۔ جاڑے کا موسم تھا، مجھے خدا جانے طوبیٰ کا تھا یا عمشیر کا۔"

"عمشیر تھا،" میں نے کہا، "رات میں مریم کی تدفین کے بعد۔"

"ہاں۔ تمھیں کیسے معلوم ہوا؟"

"میں تمھارے ساتھ تھا۔"

"کہاں؟ میں نے اس صبح تمھیں نہیں دیکھا، حالاں کہ اس روز پورا گاؤں مسجد میں جمع تھا۔"

"میں کھڑکی کے پاس تھا، آتا جاتا رہا، یہاں تک کہ تم نے کہا ولاالضالّین، آمین۔"

"اور پھر؟"

"الحمدللہ۔ بےچارہ محمد پکار کر بولا، وہ کہاں گیا جو یہاں کھڑا تھا؟"

"اور پھر؟"

اچانک خواب کا طائر اڑ گیا۔ وہ رواسی اسی طرح غائب ہو گیا جیسے وہ حامد کا گاؤں، اپنے تمام امکانات سمیت۔ جہاں میں پہلے بیٹھا تھا وہاں میں نے قبرصی کو دیکھا، اس کی آواز سن کر میرا دل سِک ہونے لگا۔ میں نے اس کے چلانے کی آواز سنی، اور شوروغل، اور سوئمنگ پول میں پانی کے پہلو کی دیواروں سے ٹکرانے کی آوازیں سنیں، اور مجھے ہیولے نظر آنے لگے جو برہنہ عورتوں اور مردوں اور چھلانگیں لگاتے اور چیختے چلاتے بچوں کی شکل کے تھے۔ قبرصی کی آواز کہہ رہی تھی:

"اس کے لیے میں پچاس پاؤنڈ اسٹرلنگ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

میں نے اور زیادہ بیدار ہونے کے لیے اپنی آنکھوں کو زور سے ملا۔ میں نے بازار میں فروخت کے لیے رکھی ہوئی چیزوں پر نظر ڈالی۔ یہ وہ عورت تھی۔ جس لمحے قبرصی نے یہ بات کہی، وہ تاریکی کا رس پی رہی تھی۔ اچانک اسے پھندا لگا اور اس کی سانس رک گئی؛ ایک آدمی اس کی مدد کو لپکا، پھر ایک عورت، ملازم اور ویٹر آ پہنچے، لوگ اکٹھے ہو گئے، اور اسے بےہوشی کے عالم میں وہاں سے لے جایا گیا۔ پھر یوں ہوا جیسے کسی جادوگر نے اپنی چھڑی گھمائی اور ــمجھے ایسا ہی محسوس ہوا۔ لوگ آن کی آن میں غائب ہو گئے؛ اور تاریکی بھی فوراً ہی اتر آئی جیسے پاس ہی کھڑی کسی کے اشارے کی منتظر تھی۔ پانی کی سطح پر کھیلتی روشنیوں کے قریب بس میں اور قبرصی رہ گئے۔ روشنی اور تاریکی کے درمیان وہ مجھ سے بولا:

"دو امریکی لڑکیاں آج صبح نیویارک سے آئی ہیں۔ بہت حسین اور بےحد مالدار۔ ایک اٹھارہ سال کی ہے اور وہ میری ہے؛ دوسری پچیس کی ہے اور وہ تمہارے لیے ہے۔ دونوں بہنیں ہیں؛ کیرینیا میں ایک ولا کی مالک ہیں۔ میرے پاس کار ہے۔ اس ایڈونچر پر کچھ حرج نہیں ہو گا۔ آؤ۔ تمہاری رنگت سے وہ فوراً متاثر ہو جائیں گی۔"

سوئمنگ پول میں روشنی اور تاریکی میں زورآزمائی ہو رہی تھی، اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قبرصی کی آواز تاریکی کی افواج کو اسلحہ

فراہم کر رہی ہو۔ اس لیے میں اس سے کہنا تو یہ چاہتا تھا کہ ٹھیک ہے، چلتا ہوں لیکن غیرارادی طور پر میرے حلق سے اور ہی آواز نکلی، اور میں پانی کی سطح پر ہوتی ہوئی حرکت پر نظریں جمائے جمائے بولا:

"نہیں، شکریہ۔ میں نکوسیا اس جستجو میں نہیں آیا۔ میں اپنے دوست طاہر ود رواسی سے ایک خاموش گفتگو کرنے آیا تھا کیوں کہ اس نے مجھ سے ملنے کے لیے لندن آنے سے انکار کر دیا تھا اور بیروت میں میں اس سے نہ مل سکا۔"

تب میں اس کی طرف مڑا — اور میری نظر کسی دہشت ناک منظر پر پڑی۔ کیا میں تخیل سے چیزیں ایجاد کر رہا تھا، یا خواب دیکھ رہا تھا، یا پاگل ہو چکا تھا؟ میں بھاگا، کہ بھاگ کر ہوٹل کے بار میں ہجوم کے ساتھ پناہ لوں۔ میں نے پینے کے لیے کچھ طلب کیا: میں اسے پہچانے یا اس کا دائمی احساس کیے بغیر پینے لگا۔ مجھے کچھ سکون ہوا۔ مگر فوراً ہی آ کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ بیساکھیوں پر تھا۔ اس نے وسکی کا ایک ڈبل منگوایا۔ کہنے لگا کہ اس کی ایک ٹانگ جنگ میں ضائع ہو گئی تھی۔ کون سی جنگ؟ ایک جنگ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون سی؟ اس کی لکڑی کی ٹانگ آج صبح ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایک پہاڑ پر چڑھ رہا تھا۔ اسے لندن سے نئی ٹانگ کے آنے کا انتظار تھا۔ کبھی اس کی آواز برطانوی لگتی، کبھی اس کا لہجہ جرمن ہوتا، کبھی وہ مجھے فرانسیسی بولتا معلوم ہوتا، وہ امریکی الفاظ استعمال کر رہا تھا۔

"کیا آپ..."

"نہیں۔ بعض لوگ مجھے اطالوی سمجھتے ہیں، بعض روسی، کچھ لوگ جرمن... ہسپانوی۔ ایک بار ایک امریکی نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کہیں میں سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تو نہیں۔ ذرا سوچو تو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کہاں کا ہوں؟ اور حضورِ والا؟"

"آپ مجھے حضورِ والا کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"کیوں کہ آپ بےحد نفیس آدمی ہیں۔"

"ایسی کیا خاص بات ہے مجھ میں؟"

"آپ آج ہیں اور کل نہیں ہوں گے -- اور پھر آپ کبھی لوٹ کر نہیں

Scanned with CamScanner

آئیں گی۔"

"یہ تو ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے۔۔ اس میں کیا خاص بات ہے؟"

"ہر شخص اس کا شعور نہیں رکھتا۔ آپ، حضوروالا، زمان و مکان میں اپنی حیثیت سے آگاہ ہیں۔"

"میں تو ایسا نہیں سمجھتا۔"

اس نے اپنا جام ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا، اپنی دونوں سالم ٹانگوں پر، یا پھر میرا تخیّل چیزوں کو مجسّد کر رہا تھا، یا میں خواب دیکھ رہا تھا، یا پاگل ہو چکا تھا، اور یوں لگا جیسے وہ قرطبی ہو۔ وہ بےحد متواضع شائستگی سے جھکا، اور یوں لگا جیسے پُول کے کنارے دیکھا ہوا اس کا چہرہ یہ احساس دلا رہا ہو کہ زندگی بےمایہ ہے۔

"میں خداحافظ نہیں کہوں گا،" وہ بولا، "تلک الوداع، حضوروالا۔"

دس بجے تھے جب میں بستر پر گیا۔ میں نے نیند لانے کی ہر ممکن تدبیر کی تھی، میں سارے دن تیرتا رہا تھا اور تھکا ہوا تھا۔ میں نے طاہر ود رواسی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی فاطمہ بنت جبرالدّار سے شادی کے بارے میں پوچھا۔ میں نے اس یادگار دن فجر کی نماز میں اس کی حاضری کے بارے میں سوال کیا۔ میں نے اس نغمے کے بارے میں پوچھا جو دونوں کناروں کو ریشمیں دھاگوں سے ملا رہا تھا، جبکہ بےچارہ محیمید لہروں میں مریم کے ہیولے کے تعاقب میں ہاتھ پیر مار رہا تھا، مگر اس نے کچھ جواب نہ دیا۔ موسیقی نے بھی میری کوئی مدد نہ کی، اور نہ مطالعے نے۔ میں باہر جا سکتا تھا، کسی نائٹ کلب میں یا یوں ہی چہل قدمی کے لیے۔ مگر میں کچھ نہ کر سکا۔ پھر درد شروع ہوا، پہلے پیروں کی انگلیوں کے سرے سُن ہوئے، پھر لہریں رفتہ رفتہ اوپر کی طرف بڑھیں یہاں تک کہ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے خوفناک پنجے میرے پیٹ، سینے، پیٹھ اور سر کو ادھیڑے ڈال رہے ہوں؛ جہنّم کی تمام آگ گویا مجھ پر لوٹ پڑی۔

میں غشی کے عالم میں درد اور آگ کے بھنور میں جا گرتا، بےہوشی اور نیم بیداری کے درمیان وہ خوفناک چہرہ میرے سامنے آ جاتا، کبھی ایک کرسی پر کبھی دوسری پر، پورے کمرے میں نمودار اور غائب ہوتا ہوا۔ میری سمجھ میں نہ آنے والی آوازیں کسی نامعلوم مقام سے آ رہی تھیں، اور ان

جانے چہرے، بےرنگ اور چڑھی ہوئی تیوریوں والے۔ میں کچھ کرنے کے قابل نہ تھا۔ گو میں کسی نہ کسی طور پر ایک قسم کے شعور کی حالت میں تھا، لیکن ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھانا اور ڈاکٹر کو طلب کرنا، یا نیچے ہوٹل کے استقبالیے تک جانا، یا مدد کے لیے پکارنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ میرے اور نامعلوم تقدیروں کے درمیان ایک خاموش جنگ جاری تھی۔ مجھے ایک طرح کی فتح ضرور نصیب ہوئی، کیوں کہ جب گھنٹے کی صبح چار بجے کی آواز پر مجھے ہوش آیا تو ہوٹل اور شہر پر سکوت طاری تھا۔ درد ختم ہو چکا تھا صرف شدید تھکن اور مایوسی کا غلبہ تھا جیسے دنیا، اپنی خیروشر سمیت، پرکاہ سے زیادہ وقعت نہ رکھتی ہو۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ صبح نو بجے مجھے بیروت لے جانے والا جہاز نکوسیا کے اوپر چکر کاٹ رہا تھا۔ اوپر سے وہ مجھے کوئی قدیم گورستان معلوم ہوا۔

اگلے روز شام کو بیروت میں دروازے کی گھنٹی بجی۔ ایک عورت ایک بچے کو لیے کھڑی تھی۔ وہ رو رہی تھی اور پہلا فقرہ جو اس نے کہا یہ تھا:

"میں فلسطینی ہوں — میری بیٹی مر گئی ہے۔"

میں کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں؛ لیکن وہ گھر میں داخل ہوئی، بیٹھ گئی اور بولی:

"کیا مجھے تھوڑا سا آرام اور بچے کو خوراک مل سکتی ہے؟"

وہ مجھے اپنی کہانی سنا رہی تھی کہ دروازے کی گھنٹی بجی۔ میں نے ٹیلیگرام کھولا: مصطفیٰ؛ عورت مجھے اپنی بدنصیبیوں کی داستان سنا رہی تھی جبکہ میں خود اپنی بدنصیبی میں غرق ہو چکا تھا۔

میں نے سب سے بڑھ کر یہ معلوم کرنے کی بےتابی میں سمندر اور صحرا عبور کیے کہ اس کی موت کب اور کیوں کر واقع ہوئی۔ مجھے بتایا گیا کہ اس روز صبح معمول کے مطابق اس نے اپنے باغ میں کام کیا تھا اور دن بھر اپنے سب معمولات جاری رکھے تھے۔ اس نے کسی چیز کی شکایت نہیں کی تھی۔ وہ رشتےداروں کے گھر گیا تھا، راستے میں ادھر اُدھر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا، واپسی میں وہ آدھی پکی ہوئی کھجوریں گھر لایا تھا اور سب کے ساتھ بیٹھ کر قہوہ پیا تھا۔ اس کی گفتگو میں کئی بار میرا نام آیا تھا۔ وہ میرے آنے کا بےتابی سے منتظر تھا کیوں کہ میں نے خط میں اسے اپنی آمد سے مطلع کر دیا تھا۔ رات کا کھانا اس نے ہلکا کھایا تھا۔ عشا کی نماز پڑھی تھی، اور دس بجے کے قریب موت کا فرشتہ اس کے پاس آیا، اور فجر کی

نماز سے پہلے وہ دنیا سے رخصت ہو چکا تھا، اور جب جہاز مجھے نکوسیا سے بیروت لے جا رہا تھا، وہ اس کی تدفین سے اسی وقت فارغ ہوئے تھے۔

تیسرے پہر کو میں اس کی قبر کے پاس کھڑا تھا، اور قبرصی اپنے رسمی لباس میں قبر کے پہلو پر بیٹھا تھا اور میری فاتحہ اور دعاؤں کی آواز سن رہا تھا۔ ایک ایسی آواز میں جو مجھے زمین اور آسمان سے آتی محسوس ہوئی اور جس نے مجھے ہر طرف سے گھیر لیا، وہ مجھ سے بولا

"تم مجھے اس روپ میں دوبارہ نہیں دیکھو گے۔ آخری لمحے کے سوا جب میں تمہارے لیے دروازہ کھولوں گا، احترام سے جھکوں گا اور تم سے کہوں گا: پہلے آپ، حضور والا" مگر میں تمہیں کسی نہ کسی روپ میں نظر آتا رہوں گا۔ تم سے میری ملاقات کسی حسین لڑکی کے روپ میں ہو سکتی ہے، جو آ کر تم سے کہے گی کہ میں آپ کے خیالات اور رائے کی قدر کرتی ہوں، اور کسی اخبار یا رسالے کے لیے تمہارے انٹرویو کی خواستگار ہو گی۔ یا کسی صدرمملکت یا حکمراں کے روپ میں جو تمہیں کسی ایسے عہدے کی پیشکش کرے گا جس کا نام سن کر تمہاری سانس رکنے لگے۔ یا زندگی کی کسی ایسی دلکشی کی صورت میں جس سے تمہاری کسی کوشش کے بغیر تمہیں بہت سی دولت ہاتھ آ جائے گی۔ یا شاید کسی بہت بڑے ہجوم کی شکل میں جو تمہیں کسی ایسی خصوصیت کی بنا پر سراہ رہا ہو گا جس سے تم خود واقف نہ ہو گے۔ یا پھر تم مجھے اپنے سے دس سال چھوٹی لڑکی کے روپ میں دیکھو گے،تم اس کی خواہش کرو گے اور وہ تم سے کہے گی: چلو پہاڑوں پر کسی الگ تھلگ کٹیا میں چلیں۔ خبردار رہنا۔ اگلی بار تمہارا باپ تمہاری جگہ اپنی جان دینے کے لیے موجود نہیں ہو گا۔ سو خبردار رہنا۔ زندگی کی میعاد طےشدہ ہے، لیکن ہم کھیل میں دکھائی جانے والی مہارت کا لحاظ کرتے ہیں۔ خبردار رہنا کیونکہ اب تم پہاڑ کی چوٹی کی طرف بڑھ رہے ہو۔"

Scanned with CamScanner

نبیل جورجی

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

قاہرہ ایک چھوٹا شہر ہے

انجینئر عادل سلیم اپنے لگژری فلیٹ کی بالکنی میں کھڑا بیچ کی ایک وسیع باغ والی بے حد چوڑی سڑک کے دوسری طرف کچھ مزدوروں کو ایک نئی عمارت بنانے میں مشغول دیکھ رہا تھا۔ تعمیر ابھی ابتدائی مرحلے میں تھی۔ کنکریٹ سے عمارت کی بنیاد رکھی گئی تھی اور پہلی منزل کے چند ستون مکمل ہوئے تھے۔ سریوں کا کاریگر، ایک لمبے بالوں والا نوجوان، مختلف ناپ کے سریے موڑنے میں مصروف تھا۔ عادل نے دیکھا کہ اس نوجوان نے اپنی جاوا موٹرسائیکل بڑی احتیاط سے، مستقبل میں اپنے کام میں لائے جانے کی منتظر ایک بڑی سی کرین سے ٹکا کر کھڑی کر رکھی ہے۔ "کیسے دیکھتے ہی دیکھتے منظر بدل گیا!" عادل کو اب تک پرانے زمانے کے راج معمار یاد تھے اور کاریگر، جو سیمنٹ کے مسالے کے بڑے بڑے تغارے اپنے سخت کندھوں پر اٹھا کر لے جایا کرتے تھے۔

سورج غروب ہونے کو تھا اور ہیلیوپولس کے اختتام پر واقع اس محلّے میں نئی زیرتعمیر عمارتوں کے کنکریٹ کے ستون دھندلی روشنی کے پس منظر میں سیاہ ڈھانچوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

جیسا کہ ہر روز اس وقت ہوتا تھا سڑک کو بیچ سے تقسیم کرنے والے

باغ میں سے بھیڑوں اور بکریوں کا ایک گلّہ باغ کی گھاس چرتا چلا آ رہا تھا، اس کے پیچھے دو بدو عورتیں تھیں جن میں سے ایک گدھے پر سوار تھی اور دوسری، جو نوعمر تھی، ساتھ ساتھ پیدل چل رہی تھی۔ اپنی روز کی عادت کے مطابق عادل نے اس نوعمر عورت پر نظریں جما دیں جو ایک ایسی سیاہ عبا میں ملبوس تھی جس سے اس کی بدن کی دلکشی چھپنے کے بجائے اور نمایاں ہو گئی تھی؛ اپنی کمر میں اس نے سرخ کپڑے کا ایک پٹکا سا باندھ رکھا تھا۔ اس کے پیروں میں پلاسٹک کی سستی چپّلیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اپنے لکژری فلیٹ کی بالکنی میں کھڑے ہوئے عادل نے خواہش کی کہ عورت کی نظر اس پر پڑ جائے؛ لیکن اگر ایسا ہو بھی جائے، وہ سوچنے لگا، تو ان بدّوؤں کے طورطریقے کچھ عجیب ہی ہوتے ہیں، اور برتاؤ کے ان آداب سے الگ جن کا وہ عادی ہے، اور اسی لیے ان سے رابطہ پیدا کرنا بیحد مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر کیا وجہ ہے، کیا غرض ہے کہ وہ اس عورت سے بات کرنے کا راستہ ڈھونڈ رہا ہے؟ وہ یہی سوچتا ہوا نظروں سے اس کا تعاقب کر رہا تھا اور وہ گلّے سے الگ ہو کر سڑک پر گزرتی ہوئی گاڑیوں کے راستے میں آ جانے والی بھیڑوں یا پیچھے رہ جانے والی بکریوں کو ہانک کر درست راستے پر لا رہی تھی۔

عادل کو، جو سوسائٹی کی حوائیں کو اپنی طرف راغب کرنے میں خاصا تجربہ کار تھا، اپنی روح کے اس طرح اسیر ہو جانے کا پورا احساس تھا، کتنے ہی دن گزر گئے تھے کہ وہ ہر روز مغرب کے وقت اسی طرح اپنی بالکنی پر کھڑا اس کو تکا کرتا تھا، اور اُدھر اُسے اس کے وجود کی خبر تک نہ تھی۔

اگر اُس روز یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا جب وہ شارع میرو پر ایک دکان سے کچھ پھل اور ترکاریاں خرید رہا تھا، اور اگر دکاندار نے ایک اور گلّے کے پیچھے چلتی ہوئی ایک اور بدّو عورت کو نہ دیکھا ہوتا، اور نام پکار کر اسے نہ بلایا ہوتا، اور اگر اس کے آ جانے پر، اس سے فحش مذاق اور تھوڑی بہت دست درازی کرنے کے بعد دکاندار نے اپنی دکان کی گلی سڑی سبزیوں کا ایک ڈھیر اس پر لاد نہ دیا ہوتا — اگر یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا، تو عادل کے ذہن میں، اس عورت کی خاطر جس نے اس کے دل پر سحر کر دیا تھا، یہ منصوبہ جنم نہ لیتا جس پر کسی بھی قیمت پر عمل کرنے کی اس نے ٹھان لی تھی۔

جیسا کہ عادل کے فلسفۂ حیات کی رو سے، ہر شخص کے اندر ایک

شیطان ہوتا ہے، تو سے خوش رکھنے اور اس کے جبر کو ٹالنے کے لیے کبھی کبھی اس کی بات مان لینا بہتر ہوتا ہے۔ سو انسپکٹر عادل مسلم نے بالآخر اس دہشت ناک، ناقابلِ یقین منصوبے پر عمل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اپنے گزشتہ چالیس برس کے تجربے کی روشنی میں اسے یاد تھا کہ اپنے اندر کے شیطان سے اس عارضی اتحاد سے اسے ایسی جرأت حاصل ہو جاتی تھی جو دوسرے رفیقوں میں اسے بیحد ممتاز کر دیتی تھی، اور اسی جرأت سے کام لے کر وہ اس سماجی مقام تک پہنچا تھا اور اسی کی مدد سے اس نے اس فلیٹ کی ملکیت حاصل کی تھی جس کی مالیت اب اس قدر ہو چکی تھی کہ وہ اس کا ذکر اپنے کنبے والوں تک کے سامنے نہیں کرتا تھا کہ کہیں وہ حیرت یا حسد کا شکار نہ ہو جائیں۔

اس طرح، شارع سرمدی پر واقع، دوسری منزل کے اس فلیٹ کی بالکنی پر سے انسپکٹر عادل مسلم نے گلّے کے پیچھے چلتی ہوئی عورت کو "اے لڑکی" کہہ کر مند آواز میں پکارا۔ جب گلّہ کوئی توجہ دیے بغیر اپنے راستے پر چلتا رہا تو اس نے دوبارہ چلّا کر آواز دی، "اے لڑکی -- اے بھیڑ بیچنے والی"، اور اس سے پہلے کہ لڑکی اس سے دور نکل جائے، اس نے زور سے "بھیڑ" کا لفظ دوہرایا۔ عادل نے صدردروازے پر پہرا دیتے ہوئے دربان کی حیرت زدگی کی کچھ پروا نہ کی جو یہ سوچ کر اپنی جگہ سے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ شاید اسی کو پکارا جا رہا ہے۔ بلکہ اس نے دربان کو ان دو بدّو عورتوں کے پیچھے دوڑ کر جانے اور انہیں یہ بتانے کا حکم دیا کہ کچھ بچی ہوئی روٹیاں ہیں جو وہ انہیں ان کی بھیڑوں کے لیے دینا چاہتا ہے۔

بالکنی پر کھڑے کھڑے عادل نے دربان کی آواز سنی جو ان دونوں کو اپنے تحکمانہ، دلالی مصر کے لب و لہجے میں پکار رہا تھا، جس پر وہ رک گئیں اور ان میں سے جو گدھے پر سوار تھی، مڑ کر دیکھنے لگی۔ جوں ہی اس نے یہ دیکھنے کو نظر اٹھائی کہ کیا معاملہ ہے، عادل کو اس کی شکل نظر آ گئی۔ مگر جہاں تک نوعمر لڑکی کا تعلق ہے، وہ گلّے کے پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ گدھے پر بیٹھی ہوئی عورت اپنی جوانی گزار آئی تھی، اور اس کا بدن فربہ اور دیکھنے کا انداز بےباک تھا جسے اس سے چھپانے کی اس نے ذرا بھی کوشش نہ کی۔ گدھے کی رسّی کھینچ کر اس نے سڑک کا وہ حصّہ پار کیا جو اس کے فلیٹ والی عمارت کو باغ سے جدا کرتا تھا، اور صدردروازے کے سامنے منتظر کھڑی ہو گئی۔ عادل نے گھر میں موجود تمام روٹیاں سمیٹیں

اور انھیں پیتل کی ایک بڑی تھالی میں رکھ کر ٹبری سے نیچے لے گیا۔ سڑک پر اتر کر وہ سیدھا اس عورت کے پاس گیا اور اس پر نظر ڈالی۔ جب اس نے اپنی ٹانگ کے پاس بندھے ہوئے تھیلے کا منہ کھولا، تو عادل نے ساری روٹیاں اس میں الٹ دیں۔

"شکریہ،" عورت نے اس کی جانب رخ کیے بغیر کہا اور چل دی۔ مگر وہ اسے سنانے کے لیے اونچی آواز میں بولا، "کل بھی لے جانا۔"

ایک وقفے کے دوران جو ایک مہینے پر پھیل گیا، عادل نے یہ معمول بنا لیا کہ اتنی روٹیاں خریدتا جو وہ خود نہیں کھا سکتا تھا۔ ایسے دنوں میں بھی جب اسے شہر سے باہر سفر پر جانا پڑتا یا پورا دن گھر سے باہر گزارنا ہوتا، وہ کاغذ کے لفافے میں بندھا ہوا روٹیوں کا بڑا سا بنڈل دربان کے حوالے کر جاتا تاکہ وہ اسے اُس بدّو عورت کو دے دے جو گدھے پر سوار وہاں سے گزرتی تھی اور جس کے پیچھے پیچھے وہ لڑکی جس کی عادل کے دل کو آرزو تھی۔

چونکہ عادل میں متوقع اور اعلیٰ امکانات کو جان لینے کی ایک خاص حس تھی، ایک قمری مہینا گزرنے کے بعد، اور اپنے فلیٹ کی عمارت کے سامنے، پیتل کی تھالی میں روٹیوں کا ڈھیر لیے، اس کے ساتھ وہ واقعہ بالآخر پیش آیا جس کے پیش آنے کی وہ آرزو کرتا رہا تھا، یعنی گدھے پر سوار عورت اپنے راستے پر بڑھتی چلی گئی اور عادل نے دیکھا کہ نوعمر لڑکی، احتیاط سے ادھر اُدھر دیکھتی ہوئی، سڑک پار کر کے اس کی طرف آ رہی ہے۔ اس سے زیادہ حسین شے کبھی عادل نے نہ دیکھی تھی۔ اس کی نبض کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بھلا یہ کس طرح ممکن تھا کہ ایسے بےپناہ حسن کو بدصورتی کا احساس دلانے پر پایا جا سکے، کیونکہ اس کے بعد اس کے سوا ہر شے کو بدصورتی ہی کا نام دیا جا سکتا ہے؟ جب وہ چلتی ہوئی بالکل اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی، اور اس کی کاجل سے آراستہ آنکھیں اس کا جائزہ لینے لگیں، تو اسے ایک شدید خطرے کا احساس ہوا جسے اس نے لڑکی کی کم سنی پر محمول کیا، جو بیس سال سے زیادہ کی نہیں رہی ہو گی۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ اس کا قد اتنا دراز، اس کی کمر اتنی پتلی اور اس کی چھاتیاں اتنی بھری

بھری تھیں، اور، جب وہ اس کے ہاتھوں سے روٹیاں قبول کر کے واپس مڑی اور جانے لگی تو چلنے میں اس کے کولھے اتنے دلکش انداز میں حرکت کر رہے تھے؟ عادل کا تخیّل منجمد ہو کر رہ گیا تھا حالاں کہ وہ ابھی تک اس سے زیادہ دور نہ گئی تھی؛ اس کا حسین چہرہ ابھی اس کی نظر کے سامنے تھا؛ اس کے رخساروں کی اٹھی ہوئی ہڈیاں، اس کی دلکش ناک اور نازک ہونٹ، کانوں میں پڑے ہوئے ہلال کی شکل کے نقرئی آویزے، اور اس کے سینے کی شان بڑھاتا ہوا خوب صورت گلوبند۔ چوں کہ یہ حسن اس سے کہیں زیادہ تھا جتنا کہ روا ہو سکتا تھا، اس لیے عادل کے ذہن پر سلمی کا خیال مستقل مسلّط رہا ۔ اسے اس کا نام اس ماں کے اسے پکارنے پر معلوم ہوا تھا جو اسے اس لیے آواز دے رہی تھی کہ کہیں یہ عاشقانہ ملاقات زیادہ طویل نہ ہو جائے۔

عادل شوق کی اس منزل میں تھا، اور اس کے دل پر چاند کی شکل والی اس ہستی کا انحصار اتنا قائم ہو چکا تھا کہ اسے اب سڑک کے اُس پار کام کرنے والے مزدوروں کی مشینوں سے کوئی الجھن نہ ہوتی تھی جو منزل بہ منزل اٹھتی ہوئی عمارت کے ساتھ ساتھ بلند ہوتے جا رہے تھے۔ اس سلسلے کے آغاز کے بعد، جو اس کے لیے جرأت کے ایک عمل کی حیثیت رکھتا تھا، اب اس کے لئے لازم تھا کہ وہ لڑکی ہر شام غروب سے کچھ پہلے اس کے دروازے پر نمودار ہو تاکہ وہ اس کو دیکھنے سے محروم نہ رہے۔ سو اس طرح انجینئر عادل سلیم حسین بدّو لڑکی سلمی کی محبّت میں گرفتار ہو گیا۔ اور جس طرح تاریخ نویس تاریخ لکھتے ہیں، اس طرح عادل نے اپنے مہندسی کے پیشے کی اصطلاحوں میں، ایک معمر ہوتی ہوئی عمارت کی شکل میں اپنے شوق کی واردات رقم کرنا شروع کی، جس کا ہر ستون ایک دن تھا اور ہر منزل ایک مہینے کے برابر تھی۔ اسے خیال آیا تھا کہ اٹھائیس دن گزرنے اور ٹھیک چاند کے مکمّل ہونے پر اپنی ماں کی جگہ سلمی خود اس کے ہاتھوں سے روٹی لینے آئے گی۔ اور ماہرِ تعمیرات کی حیثیت سے اس نے چاند کا مشاہدہ کرنا شروع کر دیا تھا؛ جب وہ گرہن میں ہوتا تو اس کی بےتابی بڑھ جاتی، اور جوں جوں اس کے مکمل ہونے کا دن قریب آتا گیا اس کی روح کے انبساط میں اضافہ ہوتا گیا، یہاں تک کہ پورے چاند کی تاریخ کو

Scanned with CamScanner

اسے اپنی محبوب کا چہرہ دیکھنے سے تسکین حاصل ہوئی۔

سات مہینوں میں اس نے سات بار اس کا دیدار کیا، ہر بار اس کے چہرے کا تاثر پہلی بار کا سا ہوتا؛ اسے دیکھ کر اس کا دل پگھلنے لگتا، عزم اور حوصلہ جواب دے جاتا، اور وہی خوف جس کی وجہ وہ نہیں جانتا تھا، پھر سے بیدار ہو جاتا۔ اس خوف کا مداوا اب صرف وہی کر سکتی تھی۔

ساتویں مہینے کے بعد سلمیٰ نے، کسی طرح کی تمہید کے بغیر، اس سے تفصیل سے بات کی تھی اور اسے اطلاع دی تھی کہ وہ ہوائی اڈے سے شمال کی جانب ایک گھنٹے کی مسافت پر واقع ایک چشمے کے قریب اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہے، اور یہ کہ یہ چشمہ کھاری پانی کا ہے مگر اس کے پاس ہی ایک اور چشمہ میٹھے پانی کا بھی ہے اور وہ کھاری پانی کے چشمے میں نہاتی اور میٹھے پانی میں اپنے بدن کو دھو کر پاک کرتی ہے، اور یہ کہ دونوں چشموں کے اردگرد کھجور کے درخت ہیں، اور گھاس اور چراگاہیں بھی ہیں۔ اس کے باپ نے، جو دونوں چشموں اور ان کے اردگرد کی زمین کا مالک ہے، عادل کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس لیے کل "وہ یہاں سے گزرے گا اور تمھیں بھیڑوں کی قربانی کے موقعے پر گھر آنے کی دعوت دے گا۔"

عادل کو اپنی سماعت پر یقین نہ آیا کیوں کہ یہ اس کے تخیّل کی رسائی سے باہر کی بات تھی۔

اگلے روز عادل خوش وضع خیموں کی اس بستی میں پہنچا جہاں کھجور کے درختوں کے نیچے چشموں تک اور ان سے آگے بھی دور دور تک ریت کا ایک وسیع صحرا پھیلا ہوا تھا۔ چشمے کے گرد اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں کا ایک بڑا سا گلّہ تھا جس سے اس کے باپ کے بہت مال دار ہونے کا پتا چلتا تھا۔ یہ یقین کرنا دشوار تھا کہ قاہرہ کے اس قدر نزدیک ایسی کوئی جگہ واقع ہو گی۔ اگر عادل کو سلمیٰ کے باپ کے ایک نئی پیژو کار چلاتے ہوئے اپنے گھر آنے پر تعجب ہوا تھا تو چشمے کے اردگرد کے اس علاقے کے حسن کو دیکھ کر وہ اور بھی حیران ہوا۔ "یہ مستقبل کی زمین ہے،" عادل نے سوچا۔ اگر وہ کسی طرح ان دنوں چند ایکڑ خرید سکے تو دیکھتے ہی دیکھتے کروڑپتی ہو جائے گا کیوں کہ یہ مستقبل کا قاہرہ ہے۔ "یہ میری زندگی کا بہترین سودا ہو گا،" اس نے خود سے کہا۔

Scanned with CamScanner

راستے میں سلمیٰ کے باپ نے عادل سے اس کے کام سے متعلق اور اس بارے میں کہ وہ پہلے کہاں رہتا تھا، اور صحرا اور اس کے باشندوں سے اس کی واقفیت کی بابت بہت سے سوال کیے۔ گوکہ عادل کو اس کے لہجے میں تجسس سے بڑھ کر کوئی چیز محسوس ہوئی، لیکن اس نے اسے بدوؤں کی فطرت اور ان کے طورطریقوں پر محمول کیا۔

جب کار خیموں کے قریب پہنچی تو عادل نے بہت سے مردوں کو ایک خیمے کے پاس جمع دیکھا جو دونوں پہلوؤں سے کھلا ہوا تھا اور جونہی سلمیٰ کا باپ اور اس کا مہمان کار سے باہر آئے سارے مرد پلٹ کر گھوڑے کی نعل کی شکل میں بیٹھ گئے۔ سلمیٰ کے باپ اور عادل کے ان کے ساتھ بیٹھ جانے سے نعل کا ایک طرف کا حصہ مکمل ہو گیا۔ ان کے بالکل سامنے میں ایسے مرد بیٹھے تھے جن کے چہروں پر وقت کی لکیریں الجھی ہوئی جھریوں کی صورت میں دکھائی دے رہی تھیں۔

صورت حال نے عادل کی توجہ کو یوں جذب کر لیا کہ وہ سلمیٰ کے وجود سے بےخبر رہا، سوائے ایک موقعے کے جب وہ ایک خیمے سے نکل کر دوسرے خیمے میں جاتے ہوئے اس کی نظر کے دائرے میں سے گزری اور عادل نے اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پایا۔

جو شخص ان میں مردوں کے درمیان میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا بولنے لگا۔ عادل نے اسے صحرا، پانی اور بھیڑوں، اور نخلستانوں اور وادی کے درمیان سے گزرتی ہوئی سڑکوں، شہروں اور پانی کے چشموں، بدوؤں کے قبیلوں اور خون کے رشتوں کی باتیں کرتے ہوئے سنا؛ اس نے سنا کہ وہ ان سڑکوں اور چشموں، درختوں اور کھجوروں، بکریوں اور نوزائیدہ بچوں کے کام آنے والے ان کے دودھ کی حفاظت کرنے کی اہمیت کے بارے میں بات کر رہا ہے۔ اس نے اسے یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ لامتناہی پھیلے ہوئے صحرا کے مقابلے میں وادی کتنی چھوٹی ہے۔

اپنی اسی حس کی مدد سے، جس سے کام لے کر عادل نے پہلے وہ سات منزلہ عمارت تعمیر کی تھی جو سات مہینوں کی منصوبہ شدہ تھی، اور ہر مہینہ انتیس دنوں پر مشتمل تھا، جس کے بعد چاند کے مکمل ہونے پر اسے سلمیٰ کا چہرہ نظر آیا تھا، اسی طرح عادل نے جان لیا کہ یہ اجتماع دراصل ایک جرگہ ہے جو اس شخص کے قتل کے سلسلے میں فیصلے کے لیے بیٹھا ہے جو ایک روز پہلے جرجہ اور خرطوم کے نخلستانوں کے درمیان

راستوں پر ملا تھا۔ یہ اس روز غروب کے بعد کی بات تھی جب اپنے ایک دوست کے ساتھ خرجہ کے نخلستان میں خام لوہے کی کانوں کا دورہ کر کے اس نے اسیوط جانے والی پختہ سڑک لینے کے بجائے وہ کچا راستہ اختیار کر لیا تھا جو انھیں مرشوط کی سمت ملا کے قریب لے گیا تھا جہاں اس کے دوست کو سڑکوں کی مرمت اور ریل کی پٹری کو نخلستان تک لے جانے کے امکانات کے بارے میں ایک رپورٹ پیش کرنی تھی۔ ٹیلوں سے وادی میں اترتے ہوئے، جہاں سے فاصلے پر سرسبز زمین دکھائی دے رہی تھی، دو ہتھیاربند آدمی ان کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ عادل کو یاد آیا کہ کس طرح، خوف اور حیرت کے، یقین اور بےیقینی کے نرغے میں، ایک ایسی رفتار سے جو اُس وقت اسے خود پر مسلط کی ہوئی محسوس ہوئی، ٹرگر پر اس کی انگلی کے دباؤ سے وہ پستول چل گیا تھا جسے وہ پہلی بار استعمال کر رہا تھا۔ ایک شخص اس کے سامنے زمین پر گر پڑا تھا، جیسے فلموں میں دکھایا جاتا ہے، اور دوسرا بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ وہ خود اور اس کا دوست، دونوں اپنی کار کی طرف لپکے تھے تاکہ جلد از جلد وادی میں پہنچ کر اس واقعے کی یاد کو مٹا دیں۔ شاید اسی باعث کہ عادل نے ایک بار کسی شخص کو قتل کیا تھا، اس میں اتنی جرأت پیدا ہوئی کہ سلمیٰ کے باپ کی دعوت قبول کر سکے۔

"اس روز،" عادل نے اس شخص کی آواز سنی جو اس سے مخاطب تھا، "اپنے دوست کے ساتھ کار میں جاتے ہوئے تم نے مبارک بن ربیعہ کو قتل کیا جو زیاد المحرب کے ساتھ تمھاری طرف آیا تھا۔"

انجینئر عادل سلیم کو شہر قاہرہ کے شمال مغرب میں واقع صحرا میں اس طرح سزائے موت دی گئی: ایک شخص نے اسے پکڑ کر اس کا سر مرمر نما پتھر کی سل پر رکھا، اور دوسرے نے ایک خم دار پھل والے خنجر کی نوک اس مقام پر اتار دی جو گلے کے اختتام پر گردن کی دونوں ہڈیوں کے بیچ میں واقع ہوتا ہے۔

محمد خضیّر

انگریزی سے ترجمہ: اجمل کمال

گھوڑوں جیسی گھڑیاں

ممکن ہے اُس سے ملاقات ہو ہی جائے۔ میں اپنی گھڑی کی مرمت کراؤں گا اور بندرگاہ کی گودی کی طرف نکل جاؤں گا۔ پھر رات کے پچھلے پہر اپنے ہوٹل واپس پہنچوں گا اور اپنے بستر پر اُسے، دیوار کی طرف منھ کیے، سوتا ہوا پاؤں گا، اُس کا سُرخ عمامہ کپڑوں کی کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہو گا۔

میرے پاس پُرانی گھڑیوں کا ایک ذخیرہ آج تک موجود ہے۔ میں نے اسے اپنے ایک چچا سے پایا تھا جو کبھی اینڈریو ویر کمپنی کے جہازوں پر ملاح کی حیثیت سے ملازم تھا۔ زنجیروں اور چاندی کے رنگ کی ڈبیوں والی پُرانی جیبی گھڑیاں، سب چمکدار نیلے کپڑے کے بٹووں میں بند، ایک چھوٹے سے لکڑی کے ڈبے میں رکھی ہوئی ہیں۔ اب کچھ عرصے سے اُن سے میری دل چسپی بہت کچھ کم ہو گئی ہے، مگر اسکول کے زمانے میں یہ مجھے بےحد مسحور رکھتی تھیں۔ میں انھیں ان کے بند بٹووں سے نکال نکال کر غور سے دیکھتا اور ان کے چلنے کے طریقے کا معائنہ کر کے ان میں وقت سے ماورا کسی بات کو دریافت کرنے کی دُھن میں لگ رہتا تھا۔ وقت جس کے بارے میں میں نے ایک دن اپنی ڈائری میں لکھا تھا کہ وہ کسی چھوٹی سی نکمـ

میں روئی کی طرح ٹھوس کر بھرا ہوا ہے۔"

اسکول کی بہار کی چھٹیوں میں ایک دن مجھے سوجھی کہ ان میں سے ایک گھڑی کو ڈبے میں سے نکال کر اپنے سیاہ لباس کی جیب میں رکھ لوں اور اس کی زنجیر اپنی واسکٹ کے کاج میں اٹکا لوں۔ میں بہت دیر مَرعی بازار میں گھومتا پھرا اور پھر ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھا۔ ویٹر آیا اور اس نے مجھ سے وقت پوچھا۔ میں نے اطمینان کے ساتھ بیلے بٹوے میں سے گھڑی نکالی۔ ڈبے کی دوسری گھڑیوں کی طرح، میری گھڑی وقت نہیں بتا سکتی تھی! اس کا کوئی بھی پُرزہ کام نہیں کرتا تھا، سوائے ڈبا میں لگے ہوئے اسپرنگ کے، جسے دبانے ہی ڈھکنا کھٹ سے کھل جاتا اور اُجلے سفید ڈائل اور اُس پر بنے ہوئے رومی ہندسوں میں سے دو کی طرف اشارہ کرتی ہوئی سوئیوں کو سامنے کر دیتا تھا اس سے پہلے کہ میں ویٹر کو بتاؤں کہ گھڑی بند ہے، اس نے جھک کر چھوٹی سی زنجیر کو اپنی طرف کھینچ لیا! گھڑی کو غور سے دیکھنے کے بعد اُس نے ڈھکنا بند کر دیا جس پر ایک بادبانی کشتی کے نقش کے گرد دائرے میں کسی غیر زبان کے حروف کھُدے ہوئے تھے۔ پھر گھڑی مجھے لوٹاتے ہوئے، وہ سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"یہ تمھارے ہاتھ کہاں سے لگی؟"

"ایک عزیز سے ترکے میں ملی تھی۔"

میں نے گھڑی کو دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ لیا۔

"کیا تمھارا عزیز کوئی جہازی تھا؟"

"ہاں۔"

"اب مشہور جہازیوں میں سے بس تین چار ہی زندہ ہیں۔"

"میرے عزیز کا نام مُقامِس تھا۔"

"مُقامِس؟ میں اُس سے واقف نہیں۔"

"وہ ایک جگہ ٹِکتا نہیں تھا۔ اُس کی موت بحرین میں ہوئی۔"

"جہازی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ تمھیں ایک اور جہری یاد ہے، جس کا نام مرروق تھا؟ آخری بار ساحل پر آنے کے بعد سے وہ فاؤ میں رہ رہا ہے۔ اُس نے وہاں گھڑیوں کی مرمّت کی دُکان کھول رکھی ہے! یہ کام اُس نے پُرتگالیوں سے سیکھا تھا۔ ایسی پُرانی گھڑی کی مرمت صرف وہی کر سکتا ہے۔"

میں نے چائے کا گلاس ختم کیا اور پیسے ادا کرتے ہوئے ویٹر سے کہا:

"تم نے کیا بتایا، کہ وہ فاؤ میں رہتا ہے؟"

"ہاں۔ ہوٹل کے پاس۔"

گاؤں جانے والی سڑک کیچڑ سے بھری ہوئی ہے اور میں اپنے سفر کو ٹالتا رہا مگر ایک دھوپ بھری صبح کو ایک بس میں، جو اسباب سے لدی ہوئی روانہ ہو رہی تھی، مسافروں کے درمیان جا بیٹھا۔ بس کے بیچ میں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے مسافر، جاڑوں میں سفر اور اس بار کی کم سردی کے بارے میں عام سے تبصروں اور سڑک کے گڑھوں کے متعلق اکادکا فقروں کے سوا، آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔ جوں ہی وہ خاموش ہوئے میں نے اپنی گھڑی نکالی۔ اُن کی نظریں اس پر جم گئیں، لیکن نہ کسی نے مجھ سے اس کے بارے میں کوئی سوال کیا اور نہ وقت دریافت کیا۔ پھر ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے گریز کرنے لگے اور اپنی توجہ کھلے وسیع دیہات اور دور دکھائی دیتی ہوئی کھجور کے درختوں کی قطار کی طرف کر لی جو ہماری گاڑی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور شطّ العرب کے کنارے کے گاؤں کو اپنے پیچھے چھپائے ہوئے تھی۔

ہم دوپہر کے وقت وہاں پہنچے اور کسی نے مجھے ہوٹل تک پہنچا دیا جو سیدھی سڑکوں کے سنگم پر واقع تھا اور اس کے سامنے چوک تھا جس کے بیچ میں چکلے سے گھرا ہوا ایک گول باغ تھا۔ ہوٹل دو نیچی منزلوں پر مشتمل تھا اور چوک کی طرف کھلنے والی بالکنی اتنی نیچی تھی کہ کوئی شخص گلی میں سے اس پر چڑھ سکتا تھا۔ مجھے ہوٹلوں کی بُو اور اُس سیلی ہوئی تاریکی سے وحشت ہوتی ہے جو ہوٹلوں میں داخل ہونے کے درآمدوں میں دن کے وقت بھی چھائی رہتی ہے، اس لیے میں نے جلدی سے اس کے مالکوں کو آواز دی۔ میرے دوبارہ پکارنے پر ایک لڑکے نے پہلو کے ایک دروازے میں سے بیچنے جھانکا اور پوچھا "سونے کی جگہ چاہیے؟"

"ہے جگہ؟" میں نے کہا۔

لڑکا کمرے میں چلا گیا اور اندر سے ایک آدمی نکلا جس سے میں نے بالکنی والے ایک کمرے کی درخواست کی۔ جو لڑکا مجھے ہوٹل کا راستہ بتانے آیا تھا، اس نے اطلاع دی کہ ہوٹل دن میں خالی اور رات کو بھرا ہوا رہتا ہے۔ جس طرح ہوٹل کا زینہ انتہائی تنگ اور بالکنی انتہائی نیچی تھی، اُسی طرح میرا کمرہ انتہائی چھوٹا تھا اور اُس میں ایک تنہا بستر تھا، مگر سورج کی روشنی بالکنی کے راستے وہاں داخل ہوتی تھی۔ میں نے اپنا بستر پر ڈال دیا اور لڑکا میرے برابر میں بیٹھ گیا۔ "دروازوں میں تالے نہیں

بس،" لڑکا بولا۔ "تالوں کی ضرورت بھی کیا ہے... مسافر ایک ہی رات تو ٹھہرتے ہیں۔"

پھر وہ جھک کر میرے کان میں بولا: "کیا تم ہندوستانی ہو؟"

مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی۔ گہری رنگت، نیل میں چُپڑے ہوئے گھنے بالوں اور چمکدار آنکھوں والے اِس لڑکے کے ہندوستانی ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ میں نے اُس سے سرگوشی میں کہا: "کیا تمھیں کسی نے بتایا ہے کہ بصرہ کو ہندوستان کا پیرِس کہا جاتا تھا اور انگریزی فوج کے ہندوستانی سپاہی اور جو سب سے پہلے فاؤ کی زمین پر اترے تھے، صرف بصرہ کی عورتوں کی خواہش کرتے تھے؟"

لڑکے نے شہوتوں کے ملاپ اور نسلوں کی آمیزش کے بارے میں میرے پوشیدہ اشارے کو نظرانداز کر دیا اور مجھ سے پوچھا کہ اگر میں ہندوستانی نہیں تو پھر کہاں کا رہنے والا ہوں۔

"میں اشعر سے آیا ہوں،" میں نے اسے بتایا۔ "مجھے گھڑی ساز سے ملنا ہے۔ کیا تم مجھے لے چلو گے؟"

"شاید تم اُس بوڑھے کی بات کر رہے ہو جس کے گھر میں بہت سی گھڑیاں ہیں،" لڑکا بولا۔

"ہاں، وہی ہو گا،" میں نے کہا۔

"اُس کا گھر ہوٹل کے پاس ہی ہے،" اس نے کہا۔ "وہ اپنی بیٹی کے ساتھ رہتا ہے اور کبھی گھر سے نہیں نکلتا۔"

لڑکا ایک ریستوران سے کھانا لے آیا اور ہم دونوں بستر پر بیٹھ کر کھانے لگے اور وہ مجھے اُس آدمی کے بارے میں بتانے لگا جسے میں نے نیچے دیکھا تھا۔ "وہ ہوٹل کا مالک نہیں ہے، بس یہاں مستقل رہتا ہے۔"

پھر منہ میں نوالہ بھرے بھرے، سرگوشی میں بولا: "اُس کے پاس پستول ہے۔"

"تمھیں بہت کچھ معلوم ہے، ہندوستانی،" میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔

اُس نے احتجاج کیا کہ وہ ہندوستانی نہیں بلکہ جاسم کا رہنے والا ہے۔ اُس کا باپ بصرہ سے کھجوریں خلیج اور ہندوستان کے ساحلی شہروں تک لے جانے والے جہازوں پر ملازم تھا۔

لڑکے نے مجھے گھڑی ساز کے گھر کے دروازے پر چھوڑ دیا۔ چوکھٹ سے اوپر کی دیوار میں سے نکالی ہوئی پتّھر کی ایک سِل کی خالی جگہ نے دروازے کو ناقابلِ فراموش بنا دیا تھا۔ جس جگہ مَیں کھڑا تھا وہاں اَستوائی برسوں میں ایک دن بیماری سے لڑتا ہوا کوئی جہازی، یا خواہش سے مغلوب کوئی سِکھ سپاہی، رُکا تھا اور پتّھر کی اُس سِل پر نظر ڈال کر جس پر کوئی تاریخ یا کوئی فقرہ کھُدا ہوا تھا، پھر اپنے نامعلوم سفر پر چل دیا تھا۔ اور ان دونوں کے بعد شاید کوئی غیرملکی ماہرآثار آیا تھا جس کی کشتی ساحل کی ریت میں پھنس گئی تھی اور وہ پانی کی سطح کے اُبھرنے کے انتظار میں شہر میں ٹھہر گیا تھا؛ پھر مشرقی چیزوں کے بارے میں تجسّس نے اسے اس سِل پر کھُدے ہوئے حروف کے دائروں کی طرف مائل کیا تھا اور وہ اسے اُکھاڑ کر اپنے ساتھ کشتی میں لے گیا تھا۔ اب مَیں، اُسی کی طرح، سمندر کے اس دروازے کے سامنے کھڑا تھا۔

لڑکے کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میں نے ہچکچائے بغیر دروازے کو دھکیل کر کھولا اور اُس جگہ میں داخل ہو گیا جو ڈیوڑھی معلوم ہوتی تھی اور جہاں دھوپ چھت کے پاس بنے ہوئے روزنوں کے راستے سے اندر آ رہی تھی، اور مجھے ڈیوڑھی کے دونوں طرف سے دکھائی نہ دینے والی گھڑیوں کی متواتر ٹک ٹک اور گھنٹوں کے شور سے وقت بتانے والے کلاکوں کی ہتھوڑیوں اور پنڈولموں سے نکلتی ہوئی مسلسل آوازوں نے گھیر لیا۔ جوں ہی میں آگے بڑھا، ایک یا زیادہ کلاکوں کے گھنٹے ایک ساتھ بج اٹھے۔ تمام کلاکوں کی جسامت، چوکھٹوں کی لکڑی کی کھنکی، اور ان کے گول ڈائلوں کی شکل، ان پر بنے ہوئے رومن ہندسے اور نازک، تیر جیسی سوئیاں بالکل یکساں تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ سوئیاں مختلف وقتوں کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

ڈیوڑھی کے ہلکے سے خم سے گزرتا ہوا میں اچانک اُس آخری عظیم جہازی کے سامنے جا پہنچا جو بڑے دالان میں ایک میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا جس پر گھڑیوں کے بےکار کل پُرزے ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔ وہ چھت سے اپنے سفید بالوں والے سر کے بالکل پاس لٹکتے ہوئے ایک لیمپ کی روشنی میں کسی گھڑی کے حرکت کرنے والے پُرزوں کو کھول رہا تھا۔ اس نے ایک آنکھ سے جس پر عدسہ جما ہوا تھا اور دوسری آنکھ سے جو عدسے

کے بغیر ہی مجھ پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر گھڑی کی کلوں کو الگ الگ کرنے میں لگ گیا۔ وہ مختصر نگاہ دیواروں پر لگی ہوئی اور کونوں میں زنگ اور گرد کھائی ہوئی گھڑیوں کے پیچوں، دندانوں اور سوئیوں سے اس انہی چہرے کا ربط واضح کرنے کے لیے کافی تھی۔ بعض گھڑیاں رُکی ہوئی تھیں اور بعض چل رہی تھیں، ان میں سب سے بڑی وہ تھی جو گھڑی ساز کے سر کے پاس کی دیوار پر آویزاں تھی؛ یہ دراصل پیتل کے بنے ہوئے ایک بہت بڑے گرینڈفادر کلاک کی اندرونی مشین تھی جس کا ڈائل نکال دیا گیا تھا اور چوکھٹا الگ کر دیا گیا تھا تاکہ وقت، اس کے دندانےدار پہیوں پر سے ہموار میکانکی تسلسل کے ساتھ پھسلتے ہوئے، خود کو اپنی خیرہ کر دینے والی عریانی میں ظاہر کر سکے: گھومتے ہوئے اسپرنگ سے لے کر پنڈولم تک، جو یکساںیت سے حرکت کر رہا تھا اور سوئیوں میں بےحد سُست اور غیرمحسوس سی لرزش پیدا کر رہا تھا۔ جب گھڑی کے دندانےدار پہیے سوئیوں کو وقت کے ایک معیّنہ فاصلے تک لے جاتے تو گھنٹے والا دندانےدار پہیا گھوم کر ہتھوڑی کو اوپر اٹھا دیتا۔ میں نے اس سے پہلے کسی گھڑی کو عریاں، دھڑکتی ہوئی حالت میں نہیں دیکھا تھا اس لیے اس ہموار دھڑکن کو دیکھ کر مبہوت رہ گیا جو جھولتے ہوئے پنڈولم اور مختلف گولائیوں کے دندانےدار پہیوں کی حرکت سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔ میں گھنٹے پر ہتھوڑی کی چوٹ پڑنے سے چونک اٹھا؛ دالان تین گھنٹوں کی آوازوں سے گونجنے لگا اور ان آوازوں کی تھرتھراہٹ بہت دیر باقی رہی، جبکہ دوسری گھڑیاں اپنے شیشےدار چوکھٹوں کے پیچھے یکساں آواز میں ٹک ٹک کرتی رہیں۔

گھڑی ساز نے اپنا سر اٹھایا اور مجھ سے پوچھا کہ آیا اُس کے سر کے پاس والے کلاک نے تین بجائے ہیں۔

پھر گھڑی کے کل پُرزوں کو کھولنے میں دوبارہ منہمک ہوتے ہوئے بولا، "گھوڑوں کی طرح! سمندر کی سطح پر دوڑتے ہوئے گھوڑوں کی طرح۔"

ڈیوڑھی میں لگے ہوئے کسی کلاک نے چھ بجائے تو اُس نے کہا، "چھ؟ امریکا میں چھ بجے ہیں۔ وہاں لوگ سو کر اٹھ رہے ہیں، جبکہ برما میں سورج ڈوبنے کا وقت ہے۔"

کمرہ ایک بار پھر پُرشور گونج سے بھر گیا۔ "سات؟ انڈونیشیا میں رات ہو گئی۔ تم نے اس سے پہلے بارہ بجے کی آواز سنی تھی؟ دنیا کے انتہائی مغرب میں لوگ گہری نیند سو رہے ہیں۔ چند گھنٹے بعد انتہائی مشرق میں

سورج طلوع ہو گا۔ کیا وقت ہوا ہے؟ میں؟ یہ ہمارا وقت ہے، یہاں خلیج کے پاس کا۔"

ایک کلاک آپ ہی آپ بجنے لگا۔ ذرا دیر بعد اُس کی گونج کئی گھنٹوں پر یک ساتھ پڑتی ہوئی ہتھوڑیوں کی آواز میں مل گئی اور کچھ کلاکوں کی آواز ان آوازوں کے درمیانی وقفے کو قطع کرتی ہوئی، اور کچھ اور کلاکوں کی آواز اُن آوازوں کے درمیانی وقفے کو قطع کرتی ہوئی بلند ہونے لگی، اور یوں اس ملےجُلے شور میں گھنٹوں کی آوازیں ایک دوسرے کا تعاقب کرنے لگیں۔ پھر ایک ایک کر کے، ہتھوڑیاں ساکت ہوتی گئیں، گھنٹوں کی آوازیں دیر دیر میں اٹھنے لگیں، یہاں تک کہ صرف ایک کلاک باقی رہ گیا۔ آخری کلاک جس نے ابھی اپنا وقت بتانا ختم نہیں کیا تھا، اب اُسے ایک تنہا، اونچی گونج کے ساتھ باہر اُنڈیلنے لگا۔

وہ میری گھڑی کو ہاتھ میں لیے ہوئے تھا۔ "کئی کلاک ایک ساتھ بجنے لگتے ہیں،" وہ بولا، "جیسے بھی اُن کے جی میں آتی ہے۔ میں نے اپنی بیٹی کو صرف ان میں چابی دینے کا کام سونپ رکھا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ گھوڑوں کی طرح دوڑ کرتے ہیں۔ میرے پاس اُن لوگوں سے خریدی ہوئی گھڑیاں ہیں جنھوں نے انھیں بصرہ پر قبضہ ہونے کے بعد شہر سے بھاگتے ہوئے تُرک ملازموں کے گھروں سے لُوٹا تھا۔ ایسی گھڑیاں بھی میرے ہاتھ آئیں جو بعد میں ہجرت کرنے والے یہودی چھوڑ گئے تھے۔ میرے دوست، جہازوں کے کپتان، جو یہاں مجھ سے ملنے آئے، یوروپ کی بنی ہوئی گھڑیاں میرے ہاتھ بیچتے تھے۔ وہاں راہداری میں لگے ہوئے اُس کلاک کو دیکھ رہے ہو؟ وہ فاؤ کے قلعے کی گیریزن کے تُرک کمانڈر کے گھر میں لگا ہوا تھا۔"

میں نے ڈیوڑھی میں رکھی ہوئی گھڑیوں کی الماریوں کی تاریکی میں شیشے کے پیچھے سری سے ہلتے ہوئے پنڈولم کی دھندلی چمک دیکھی۔ پھر اُس سے اپنی گھڑی کے بارے میں پوچھا۔ "تمھاری گھڑی؟ بہت نادر ہے۔ اب ایسی گھڑیاں نہیں بنتیں۔ میں نے بہت عرصے سے ایسی گھڑی کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا، مگر اسے کھول کر دیکھوں گا۔ تم شہر کا ایک چکّر لگاؤ اور رات کو پھر آنا۔"

میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ میں رات سے پہلے ہی لوٹ آؤں گا۔ کلاکوں کے ایک ایک کر کے بجتے ہوئے گھنٹوں نے مجھے الوداع کہا۔ فاؤ میں چار گھنٹے کھٹکے نی برسحوم کسوں میں شام کے سات بجے ہیں۔ چار گھنٹے، نیویس

اٹرس کے جنگلوں میں صبح آٹھ بجے کے وقت... کارگاہ کے باہر شور تھم گیا تھا، مشین کے تیل اور پرانی لکڑی کی بُو بھی اب نہیں تھی۔

میں مغرب کے وقت واپس پہنچا۔ میں نے پرانی سڑکوں میں گھوم کر وقت گزارا تھا جو برطانوی قابض فوجوں کا مسکن رہی تھیں؛ پھر میں مچھلی بازار کے پاس کے ایک قہوہ خانے میں بیٹھا رہا تھا۔

میں نے گھڑی ساز کو اُس کی پہلی جگہ پر نہ پایا۔ پھر مجھے ایک بڑی سی خالی الماری کا احساس ہوا جسے دھکیل کر کلاکوں کے درمیان کی خالی جگہ میں رکھ دیا گیا تھا۔ گھڑی ساز ایک صحن میں مٹی کے کوزوں سے بنی ہوئی ایک کل کے سامنے کھڑا تھا، جو میرے اندازے کے مطابق کسی قسم کی پانی کی گھڑی تھی۔ جب اُس نے مجھے دیکھا تو آواز دی: "اِدھر آؤ۔ آ جاؤ، میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔"

میں لمبے سے شہتیر سے لٹکتے ہوئے کوزوں کی طرف بڑھا؛ پانی اُن میں سے ایک نچلے شہتیر میں لگے ہوئے کوزوں میں قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا اور وہاں سے دھات کے ایک ڈھلوان تختے پر بہتا ہوا زمین کی طرف آ رہا تھا جس پر پانی کی سطح کی بلندی ناپنے کے نشان لگے ہوئے تھے۔

"پانی کی گھڑی؟"

"تم نے ایسی گھڑی پہلے کبھی دیکھی ہے؟"

"میں نے ان کا ذکر پڑھا ہے۔ یہ قدیم لوگوں کی ایجاد تھی۔"

"فارس کے لوگ انھیں پنجان کہتے تھے۔"

"میں نہیں سمجھتا یہ درست وقت بتاتی ہو گی۔"

"بالکل نہیں۔ اس کے حساب سے دن بیس گھنٹوں کا ہوتا ہے۔ اس حساب سے میری عمر نوّے نہیں بلکہ ایک سو آٹھ سال ہے۔ اور انگریزوں کو مصرہ میں داخل ہوئے ساٹھ کے بجائے اِکہتّر سال ہو چکے ہیں۔ میں نے اسے مسقط کے ایک ملّاح سے بنانا سیکھا تھا، جس کے ساحل کے پاس کے گھر میں ایسی ہی ایک گھڑی تھی۔"

چھوٹے سے صحن پر اندھیرا اُترنے لگا تھا، میں اُس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا، صحن کے دو بند دروازوں کے پاس سے مڑ کر اندر آیا۔ وہ خالی الماری کو گھسیٹ کر اپنی پچھلی جگہ پر لے گیا اور کرسی پر آ بیٹھا۔ بہت

سے نسل پہنے ہونے کی وجہ سے وہ کم بُوڑھا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کا بدن ایک کے اوپر ایک پہنے ہوئے کپڑوں میں گم ہو گیا تھا اور سر پر بہت بڑا طربوش بندھا ہوا تھا۔

"میں نے سُنا ہے کہ تمھاری ساری زندگی سمندر میں گزری ہے۔"

"ہاں۔ اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ ہماری زندگیاں ہمیشہ پانی سے وابستہ ہوتی ہیں۔ میں برطانوی ہند کے ایک جہاز پر گھوڑوں کی تجارت کرنے والے ایک انگریز کے پاس سائیس کے طور پر ملازم تھا۔"

وہ نیچے سامنے پڑے ہوئے کھجوروں کے ٹکڑوں سے کھیلنے لگا، پھر بولا:

"اس نے اپنا ایک عربی نام رکھ لیا تھا۔ ہم اُسے سَرور صاحب کہتے تھے۔ وہ جنوب کے دیہات سے نجدی گھوڑے خریدتا تھا جنھیں بعد میں سمندر کے راستے بمبئی لے جایا جاتا اور وہاں انھیں جمع کر کے انگلستان کی گھڑدوڑ کے میدانوں میں بھیج دیا جاتا۔ اس سفر میں ہمارے پندرہ دن سمندر میں گزرتے۔ ہم صرف خلیج کی بندرگاہوں میں رکتے ہوئے جاتے تھے۔ مسقط میں ہم چند دن ٹھہرتے تھے۔ جب کبھی مخالف ہوائیں تیز ہوتیں، ہمیں مہینا بھر سمندر میں رہنا پڑتا۔ کپتان، باورچی اور جہاز چلانے والے ہندوستانی تھے جبکہ دوسرے لوگ، جہازی اور سائیس، مسقط، جاسک اور بحرین کے رہنے والے تھے۔ باقی لوگ بحرِہند کے جزیروں کے تھے۔ ہمارے غوطہ خور کویتی ہوا کرتے تھے۔ مجھے ساحل پر گھوڑوں کو نہلاتے یا انھیں جہاز پر لے جاتے ہوئے اُن غوطہ خوروں کے چھوٹے قد، سیاہ جسم اور گندھے ہوئے بال اب تک یاد ہیں۔ میں سائیسوں میں سب سے کم عمر تھا۔ میں نے اپنا پہلا سمندری سفر بارہ سال کی عمر میں شروع کیا تھا۔ میں اپنے باپ کے ساتھ جہاز پر ملازم ہوا تھا جو کپتان کا نائب تھا اور ذخیرے اور مشینوں کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ میرے باپ کو ملا کر ہم تین تھے جو اسٹورروم میں بوریوں اور کوئلے، مچھلی کے تیل، رسیوں اور خشک مچھلی کے پیپوں کے درمیان ناریل کی چھال کے بنے ہوئے بستروں پر سوتے تھے۔"

"کیا تم نے بہت کمایا؟"

"ہم نے؟ نہیں۔ ہم نے کچھ خاص نہیں کمایا۔ تاجر نے بہت کمایا۔ ایک گھوڑے کی قیمت بمبئی میں آٹھ سو روپے ملتی تھی، اور ہمارے انگلستان پہنچتے تک پندرہ سو روپے ہو جاتی تھی۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے کی اُجرت ہمیں واپس بصرہ پہنچنے پر ملتی تھی۔ ہم میں سے بعض لوگ واپسی کے

Scanned with CamScanner

سفر میں بیچنے کے لیے ہندوستان سے چیزیں خرید لیتے تھے؛ کپڑا، مسالے، چاول، شکر، عطر، اور لکڑی، اور کبھی کبھی مور اور بندر بھی۔"

"کیا تم لوگ گھوڑوں کو جنگ میں بھی استعمال کرتے تھے؟"

"میں نے خود جنگ میں حصّہ نہیں لیا۔ ویسے بےشک گھوڑوں کو جنگ میں استعمال کیا جاتا تھا۔ جب تُرکوں نے ہماری گھوڑوں کی تجارت پر پابندی لگا دی کیوں‌کہ اُنھیں جنگی استعمال کے لیے ان کی ضرورت تھی، تو ہم دریا کی دوسری طرف چلے گئے۔ حرّم شہر میں ایک اصطبل اور ایک کارواں‌سرائے ہماری ملکیت تھی۔ ہم وہاں سے گھوڑوں کو اسمگل کر کے تُرک کسٹم والوں کی گرفت سے دور لے جانے لگے۔ جس رات ہمیں سفر کرنا ہوتا، ہم گھوڑوں کو خوب کھلاتے پلاتے اور منھ اندھیرے اصطبل میں جا کر ہر سائیس اپنے اپنے گھوڑے کو باہر نکالتا۔ مجھے چارے اور سازوسامان لے جانے کا کام سونپا گیا تھا، اور جو لڑکے مجھ سے عمر میں ذرا بڑے تھے اُنھیں پانی، رسّیوں، زنجیروں اور دوسرے اوزاروں کو لے جانے کا۔ اصطبل ساحل کے بہت قریب تھا، مگر جب گھوڑوں کو لگام سے گھسیٹ کر جہاز کی طرف لے جایا جاتا، جو ساحل سے بندھے ہوئے لنگر کے دوسرے سرے پر کھڑا ہوتا تھا، تو وہ بہت شور مچاتے اور دُھول اُڑاتے تھے۔ جہاز ڈوبنے لگتا اور جس وقت سائیس گھوڑوں کو اُن کے نام سے پکار کر خاموش کراتے ہوئے اُنھیں رسّیوں سے اُن کی جگہ پر باندھ رہے ہوتے، پیال کے چھوٹے چھوٹے تنکے اُڑ کر ہمارے سروں پر چپک جاتے۔ کام آسان نہیں تھا؛ سفر کے دوران لہروں یا نظر نہ آنے والے سمندر سے کسی گھوڑے کو جوش آ جاتا یا وہ بیمار پڑ جاتا اور اُس کے سائیس کو نگرانی اور دیکھ‌بھال کے لیے رات بھر اس کے پاس رہنا پڑتا۔ اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے ہمیں کسی سائیس کے اپنے گھوڑے کو اس طرح کے فقروں سے تسلّی دینے کی آواز آتی؛ "چُپ ہو جاؤ، چُپ ہو جاؤ، جانِ عزیز۔ وہاں کھانے کو اچھی گھاس ملے گی۔" مگر یہ گھوڑا، جس کا نام جانِ عزیز تھا، عدن کے آس پاس چل بسا۔ فجر کے وقت جہازیوں نے اسے اٹھا کر لہروں کے سپرد کر دیا۔ وہ بڑی کہرآلود صبح تھی اور میں نے ایک لالٹین اٹھا رکھی تھی؛ مجھے اُس کے بڑے سے جسم کے لہروں سے ٹکرانے کی آواز سنائی دی، لیکن وہ مجھے نظر نہ آیا۔ البتہ میں نے اُس کے سائیس کا چہرہ اپنے قریب دیکھا — وہ اپنے سفر سے خالی ہاتھ لوٹے گا۔"

دو بار میں کلاک ایک ساتھ بج اٹھے۔ میں نے اُس سے کہا

"کیا تم مسقط میں ٹھہرا کرتے تھے؟"

"ہاں۔ کیا میں نے تمہیں اپنے مسقطی میزبان کے بارے میں بتایا ہے؟ اُس کا لکڑی کا مکان ایک کھاڑی کے کنارے تھا جس کے دوسرے کنارے پر پتھر کا بنا ہوا پرانا قلعہ تھا۔ ہم کشتی میں بیٹھ کر اُس کے مکان پر جاتے۔ وہ پیدائش کے اعتبار سے کوہستانی تھا اور کھاڑی کے مقابل کے پہاڑوں کے ایک قبیلے کا فرد تھا۔ وہ سپیرا بھی تھا۔ سُرور صاحب کا وہ بہت قریبی دوست تھا اور اسے پہاڑی جڑی بُوٹیوں سے تیار کیا ہوا ایک مرہم مہیا کرتا تھا جسے لگاتے ہی بگربر کے چہرے کا رنگ گہرا سرخ ہو جاتا اور وہ لیمپ کی روشنی میں چٹانوں کے درمیان ہچکولے کھاتی ہوئی لہر کی طرح جھلملانے لگتا۔ اس کے بدلے میں مسقطی کو تمباکو ملتا تھا۔ تمباکونوشی میں میں اُن کا ساتھ نہیں دیتا تھا، مجھے ایک طرح کا بخور چبانے کی عادت تھی جو ساحلی بازاروں میں عام ملتا تھا۔ میں کمرے میں اونچائی پر بنے ہوئے ایک ستر پر چڑھ کر بیٹھ جاتا اور اُن کو اپنی اپنی خنجروں کی پیٹی اتار کر اپنے سامنے اپنی پگڑیوں کے پاس رکھ کر، آگ کے پاس آرام سے لیٹے ہوئے، نارجیلوں سے تمباکو کے کش لے کر ہوا میں دھواں اُڑاتے دیکھا کرتا۔ اُن کی داڑھیوں میں دھواں بھر جاتا اور جب وہ خیالوں میں گم سر گھما کر تاجر کی طرف دیکھتے تو ان کے کانوں کے پاس، کنگھی کیے ہوئے بالوں کی لٹوں میں، دھوئیں کے چھلّے اٹک جاتے۔ پروں کی تکیوں سے ٹیک لگائے ہوئے تاجر نے ہندوستانی کپڑے کی شوخ رنگوں والی شلوار پہن رکھی ہوئی تھی اور بدن کشمیری اُون کی عبا میں لپٹا ہوا ہوتا تھا، جہاں تک اُس کے ریشمی صافے کا تعلق ہے وہ جہازیوں کی پگڑیوں کی طرح، اس کے سامنے پستول کے پاس دھرا ہوتا تھا۔"

"تم نے کہا کہ مسقطی سپیرا بھی تھا؟"

"اُس کے پاس سانپوں کی ایک بڑی سی ٹوکری تھی جس میں وہ جہازیوں میں سے کسی کو لٹا دیتا اور پھر زندہ باہر نکال لیتا تھا۔ اُس کا منحنی سا بدن اُس کی چمکیلی عباؤں میں گم معلوم ہوتا تھا جس طرح اُس کا چھوٹا سا سر پُھندنوں والی زعفرانی پگڑی میں غائب ہو جاتا تھا۔ ہمیں اس کی حیرت انگیز بھوک کو دیکھ کر بڑی کوفت ہوتی تھی۔ وہ رات بھر میں ٹوکری بھر کھجوریں کھا جاتا اور اتنا پانی پی لیتا کہ دس گھوڑوں کے لیے کافی ہو۔ وہ بہت حیران کن آدمی تھا، عجیب حرکتیں کیا کرتا تھا، تمباکو کی

ٹک کش لے کر وہ تھوڑی دیر بعد اپنے منہ اور ناک سے دھواں نکالنے لگتا اور متواتر پانچ منٹ تک نکالتا رہتا۔ ہم نے اُس کا پتھریلا چہرہ نہیں دیکھا جس کے اردگرد دھوئیں کے بادل سانپوں کی طرح لہراتے اور ناچتے تھے۔ اُس کی سات بیویاں تھیں جن کے لیے اُس نے پہاڑ کے قدموں میں زمین کھود کر سات کمرے بنائے تھے جن کا رخ کھاڑی کی طرف تھا۔ اسے اُن عورتوں کے نام لینے میں کوئی حیا نہیں آتی تھی: کوہستانی پھول، دوپہر کی دھوپ، سمندر کا موتی، ستارۂ صبح۔ وہ مزےدار قصّوں اور عجیب سحری داستانوں کی کان تھا اور اُس کی باتوں سے ہم اپنے گھوڑوں کے نام اخذ کیا کرتے تھے۔ رات کے ختم ہوتے وہ ہمیں سوتا چھوڑ کر پہاڑ پر چلا جاتا۔ ایک بار سفر کے خاتمے پر ہم سات راتوں تک مسقطی کے مہمان رہے، اور اس دوران اُس کے قبیلے کے لوگ تمباکو پینے کے لیے ہمارے پاس آتے رہے: وہ بہت کم بولتے، تاجر کی طرف ناپسندیدگی سے دیکھتے، اور اپنی قدیم رائفلیں اٹھائے خاموشی سے رخصت ہوتے۔

"رات کے وقت ہمارا کھانا مسالےدار چاولوں اور بُھنے ہوئے گوشت یا مچھلی پر مشتمل ہوتا۔ پینے کے لیے ہمیں پیتل کے کٹوروں میں میٹھا شربت دیا جاتا۔ رہا مسقط کا باداموں والا حلوہ، جو منہ میں رکھتے ہی گھُل جایا کرتا تھا، تو تلخ قہوہ بھی اُس کی خوشبودار مٹھاس ختم نہیں کر سکتا تھا۔ صبح لوٹ کر وہ جھاڑیوں کے سروں پر سے دھوئیں کے بادل ہٹاتا اور ہمیں ایک شربت دیتا جسے پی کر ہمارے رات کے کھانوں کی مار کھائے ہوئے معدوں کا فعل درست ہو جاتا۔"

ٹکاٹک کلاکوں کی آوازوں کے شور نے اسے مزید تفصیل میں جانے سے عارضی طور پر روک دیا، مگر اپنی بات دوبارہ شروع کرنے کے لیے اُس نے گھنٹوں کے شور کے تھمنے کا انتظار نہیں کیا:

"آخری رات کو اُس کے کرتبوں نے خاصی خوفناک صورت اختیار کر لی۔ سائیس اُس سے اپنے گھوڑوں کی بیماریوں کے جادوئی علاج طلب کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود انھیں خوف تھا کہ اُس کے جادو کا بُرا اثر پھیل جائے گا اور اُن کے گھوڑوں کی جان لے لے گا۔ اور ہوا بھی یہی کہ ہوا کے شدید جھکڑوں کی زد میں آ کر ہمارا جہاز کھاڑی میں داخل ہونے کی جگہ کے پاس ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ ڈوبنے سے بچ گئے لیکن مسقط کا سپیرا اُن میں نہیں تھا۔ وہ عمانی کی ایک عورت سے

شادی کرنے کے ارادے سے جہاز کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا، مگر اونچی لہروں نے اس کی چیخوں کو دبا لیا اور جادو کو مٹا ڈالا۔"

"اور گھوڑے؟"

"انھوں نے لہروں کا جان توڑ مقابلہ کیا۔ وہ ساحل کی چٹانوں کی طرف مڑنے لگے، گھوڑے لہروں کے سفید گھوڑوں سے زورآزمائی کر رہے تھے۔ سب کے سب ڈوب گئے۔ وہ گھوڑوں والے جہاز میں میرا آخری سفر تھا۔ اس کے بعد جنگ سے پہلے کے چند سال، میں ڈ.ک کے جہازوں پر کام کرتا رہا۔"

اس نے ذہن پر بڑا زور دے کر یاد کیا اور کہا،

"بحرین میں میں نے ایک عورت سے شادی کی جس سے میری بیٹی پیدا ہوئی جسے میں نے سمندر کے بیٹوں سے بیاہ دیا۔ میں جنگ کے بعد تک وہاں کشتیاں بنانے والوں کے ساتھ رہتا رہا۔ پھر میں تیس کی دہائی میں مصر لوٹ آیا اور وہاں سے گھڑیاں خرید کر فاؤ میں آ بسا اور یہاں کی ایک عورت سے شادی کر لی۔"

"تم جیسے جہازی اب اکادکا ہی رہ گئے ہیں۔"

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں رہتا ہوں اور میں نے بتایا کہ میں ہوٹل میں رکا ہوں۔ وہ بولا،

"میرا ایک دوست بھی وہاں رہتا تھا۔ پتا نہیں اب زندہ ہے یا نہیں۔۔ میں بیس سال سے باہر نہیں نکلا۔"

پھر گھڑیوں کے ٹوٹے ہوئے پرزوں کے ڈھیر میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے اس نے کہا،

"کیا تم صرف اپنی گھڑی کی مرمت کرانے فاؤ آئے ہو؟"

میں نے اسے جواب دیا کہ بعض شہر ایسے ہوتے ہیں جہاں آدمی کو جانا ہی ہوتا ہے۔ اس نے میری گھڑی مجھے دے دی۔ وہ چل رہی تھی۔ اسے میرے ہاتھ پر رکھنے سے پہلے اس نے ڈھکنے کا معائنہ کیا جس پر ایک جہاز کا نقش اس کے تکونے بادبان سمیت کُھدا ہوا تھا۔ اس قسم کے جہاز کو سمبک کہا جاتا ہے، اس نے بتایا۔

میں نے ڈھکنا کھولا۔ سوئیاں اپنی سست رفتار سے گھوم رہی تھیں۔ میری ہتھیلیاں گھڑی کے گرد بند ہو گئیں اور ہم وہاں لگے ہوئے کلاکوں میں سمندر کو گونجتا ہوا سننے لگے۔ گھڑیوں کے چہروں کی گلیوں میں گھوڑوں کی چھوٹی ٹاپیں دوڑتی ہیں۔ بڑے گرینڈفادر کلاک کے سینے میں ابھی

Scanned with CamScanner

اغوا کر لیا جاتا ہے۔ گھڑیاں ٹک ٹک کر رہی ہیں اور گھنٹے بجا رہی ہیں؛ گونجتی ہوئی ٹاپیں، لہروں کی طرح بڑھ کر آتی ہوئی گھنٹوں کی آواز۔ ایک گھنٹا: گیلی لکڑی کے ساتھ رسّیوں اور زنجیروں کی رگڑ۔ دو گھنٹے: لنگر کا بلبلے کھرے سمندر میں گرنا۔ تین: چٹانوں سے لہروں کا ٹکراؤ۔ چار: اُمڈتا ہوا طوفان۔ پانچ گھوڑوں کی ہنہناہٹ۔ چھ۔۔۔ سات۔۔۔ آٹھ۔۔۔ نو۔۔۔ دس۔۔۔ گیارہ۔۔۔ بارہ۔۔۔

پیچ دار گلی کی چوڑائی اتنی نہیں ہے کہ کوئی لاری گزر سکے، لیکن ایک بھاری نم رات اور اپنے گھوڑوں کو باگیں تھام کر لاتے ہوئے بیوپاری، اور ایک سمندرزدہ شخص جس نے اپنی مٹھی میں ایک جیبی گھڑی اب بھی مضبوطی سے دبا رکھی ہے، اور پانی سے اور گلی کی ڈھلان سے اور خم کھاتی ہوئی دیواروں سے بچنے کی کوشش کر رہا ہے -- یہ سب اس گلی میں داخل ہو جاتے ہیں۔ گہری ہوتی ہوئی تاریکی اور خاموشی کے ساتھ ساتھ گلی کے موڑ بڑھتے جاتے ہیں۔ روشنی سامنے والے موڑ سے آ رہی ہے جس کی طرف میرے قدم تیز ہو جاتے ہیں۔ اپنے رس رس کر اندر آنے کے انداز اور اپنی شعاعوں کی قوت کے باعث یہ روشنی یوں لگتی ہے جیسے دیوار سے لگ کر چل رہی ہو اور اُن چہروں اور جسموں کی نم اینٹوں جیسی جلد میں نقش کڑھتی جا رہی ہو جو مختلف نسلوں کے اُن بیوپاریوں اور تاجروں کی نقابیں ہیں جو مجھ سے پہلے یہاں سے گزرے تھے اور جو صرف اپنے سروں کی پوشش سے پہچانے جا سکتے ہیں؛ نجد اور جنوبی دیہات کے بدو اپنے کفیے اور عقال سے، عراق کے شہری آفندی اپنے سداروں سے، فارس سے آنے والے بکری کی کھال کے بنے ہوئے طربوشوں سے، عثمانی افسر، فوجی اور اہلکار اپنی پُھندنے‌دار ٹوپیوں سے، ہندوستانی اپنی سرخ پگڑیوں سے، یہودی اپنی سپاٹ سرخ ٹوپیوں سے، راہب اور مشنری اپنے سیاہ سرپوشوں سے، یورپی جہازوں کے کپتان اپنی بحری ٹوپیوں سے، بھیس بدلے ہوئے محقق۔۔۔ وہ سب گلی کے آخری موڑ سے آتی ہوئی سرسراتی آواز، پُراسرار گڑگڑاہٹ، اونچے جنگلے کے پیچھے سے سنائی دیتی ہوئی لہروں کی دبی دبی بےچینی کی طرف تیزی سے مڑ گئے۔۔۔ سامنے ناؤ کی بندرگاہ کی گودیاں ہیں؛ پانی میں کچھ فاصلے تک بڑھے ہوئے لکڑی کے پلوں کو راہ دکھاتی ہوئی روشنیاں؛ ان کے

درمیان کی خالی جگہوں میں کشتیاں پہلو بہ پہلو لنگرانداز ہیں اور ان کی بتّیاں ہچکولوں سے ہل رہی ہیں؛ بیچ کی دو گودیوں کے درمیان ایک مال بردار جہاز کھڑا ہے جس کی بتّیاں روشن ہیں۔ میرے لیے دریا کے بیچ میں ادھر اُدھر ہلتی ہوئی بتیوں کو ایک دوسرے سے جدا پہچاننا ممکن تھا۔ میں گودیوں کے زیادہ قریب نہیں گیا، بس ان سے ادھر دریا کے تاریک اور خالی پھیلاؤ کے سامنے کھڑا رہا۔ مجھے حیرت ہوتی جب ایک آدمی نے، جو شاید بندرگاہ پر چوکیدار یا قلی کے طور پر کام کرتا ہو گا، میرے پاس آ کر وقت پوچھا۔ گیارہ۔

ہوٹل کی طرف واپسی کے لیے میں دوسرا راستا اختیار کر کے بند دکانوں کے پاس سے ہو کر گزرا۔ میں انتہائی چوکنّا تھا۔ ہوٹل کے داخلے کے برآمدے میں چمکدار روشنی ہو رہی ہو گی۔ بیچ میں تیل کا ہنڈا رکھا ہو گا، اور ایک کونے میں سامان، سوٹ کیس، پانی ٹھنڈا کرنے کی مشین اور ایک الماری رکھی ہو گی۔ میز پر ایک آدمی بیٹھا اونگھ رہا ہو گا، اور اپنی انگلیوں میں دبے سگریٹ کو بھول چکا ہو گا۔ ہو گا یہ کہ میں اپنے کمرے کی طرف مڑوں گا، دروازہ کھولوں گا، اور اپنے بستر پر اُسے سوتا ہوا پاؤں گا؛ اُس کا منہ دیوار کی طرف ہو گا اور اُس کا سُرخ عمامہ کپڑوں کی کھونٹی پر ٹنگا ہوا ہو گا۔

غسّان کنفانی

انگریزی سے ترجمہ: عطا صدیقی

بندے کا قلم

اگر وہ بُری طرح پھٹے حالوں نہ ہوتا تو کوئی بھی اُس کے بارے میں یہی کہتا کہ وہ شاعر ہو گا۔ اس نے اپنی ٹین کے ڈبّوں اور لکڑی سے بنی کٹیا کے لیے جو جگہ منتخب کی تھی وہ حقیقتاً شاندار تھی۔ چوکھٹ کے پاس ہی سمندر کٹیلی چٹانوں کے قدموں میں اپنی بیٹھی ہوئی یکساں آواز کے ساتھ ٹھاٹھیں مارتا رہتا تھا۔ اُس کا چہرہ سوکھا مُرجھایا ہوا اور داڑھی سفید تھی جس میں یہاں وہاں کوئی کوئی سیاہ بال بھی جھلکتا تھا۔ آنکھیں اُس کی گھنی گھنی پلکوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور اس کے رخسار کی ہڈیاں دو چٹانوں کے مانند یوں اُبھری ہوئی تھیں جیسے اُس بڑے اُبھار کو جو کہ اس کی ناک تھی، دونوں جانب سے سہارا دے رہی ہوں۔

ہم اُس طرف کس لیے گئے تھے؟ اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ اپنی چھوٹی سی کار میں ہم ایک بےہنگم دلدلی سی سیدھی سڑک پر پڑ لیے تھے۔ ہم کو چلتے چلتے تین گھنٹوں سے زیادہ ہو گئے تھے جب ثابت نے کھڑکی میں سے اشارہ کرتے ہوئے ایک فلک شگاف نعرہ مارا:

"وہ رہا بندے کا قلم!"

بندے کا یہ قلم ایک لحیم شحیم چٹان تھی جس کے نچلے حصّے کو

سمندر کی لہروں نے کچھ اس طرح چاٹ ڈالا تھا کہ اب وہ کسی ایسے دیوقامت پرندے کے پروں کی طرح نظر آتی تھی جس نے اپنے شہپروں کو سمندر کے شوروغل پر تان رکھا ہو۔

"لوگ اس کو بڈھے کا قلعہ کیوں کہتے ہیں؟"

"پتا نہیں۔ شاید اس کے پیچھے کوئی تاریخی واقعہ ہو جس سے یہ نام پڑا۔ وہ کشتیا دیکھ رہے ہو؟"

ایک بار پھر ثابت نے اشارہ کیا۔ اس بار یہ اشارہ اس کشتی کی طرف تھا جو اس دیوقامت چٹان کے سائے میں واقع تھی۔ اس نے انجن بند کر دیا اور ہم سب کار سے اتر پڑے۔

"لوگ کہتے ہیں ایک نیم پاگل بڈھا اس میں رہتا ہے۔"

"اکیلا کیا کرتا ہو گا اس خرابے میں؟"

"وہی کچھ جو کوئی نیم پاگل بڈھا کرے۔"

دور سے ہم نے بڈھے کو اپنی چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھے دیکھا۔ وہ اپنا سر دونوں ہتھیلیوں کی رکاب میں رکھے سمندر کو تک رہا تھا۔

"کیا خیال ہے، بڈھے کی کوئی خاص داستان ہو گی؟ تم اسے نیم پاگل کہنے پر کیوں مصر ہو؟"

"پتا نہیں۔ میں نے یہی سنا ہے۔"

ثابت نے اپنی پسندیدہ جگہ پہنچ کر ریت کو ہموار کیا، پانی کی بوتلیں پٹخیں، تھیلے میں سے کھانے پینے کی اشیا نکالیں اور بیٹھ گیا۔

"کہتے ہیں اس کے چار بیٹے ہیں جن کی قسمت نے یاوری کی اور اب وہ صلعے کے امیرترین لوگوں میں سے ہیں۔"

"پھر؟"

"بیٹوں میں اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ کون باپ کے لیے بسیرا مہیا کرے۔ ہر ایک کی بیوی اپنی الگ رائے رکھتی تھی اور اپنی چلانا چاہتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بڑے میاں نکل بھاگے اور یہاں آن بسے۔"

"یہ تو عام سا واقعہ ہے۔ اس بات سے تو بڈھے کو نیم پاگل نہیں ہونا چاہیے تھا۔"

ثابت نے میری طرف ہونقوں کی طرح دیکھا۔ پھر اپنی اکٹھا کی ہوئی تھوڑی سی چھپٹیوں کو آگ دکھائی، جگ میں پانی بھرا اور اسے آگ پر رکھ دیا۔ "کہانی میں غور طلب نکتہ یہ ہے کہ آیا راہ فرار اس کے نیم پاگل دماغ نے

اختیار کی یا اس کے ہوش مند ذہن نے۔"

"وہ چند قدم دور ہی تو ہے۔ کیوں نہ چل کر اس سے پوچھ لیں؟"

ثابت نے آگ پر پھونکیں ماریں، پھر دورانو ہو کر سیدھا ہوا اور اپنی آنکھیں ملنے لگا۔

"اس کو دیکھ کر جو حال میرے دل میں آیا ہے میں برداشت نہیں کر سکتا۔"

"کیسا خیال؟"

"یہی کہ آدمی ستّر برس تک اپنی زندگی سیدھے سُبھاؤ گزار دے، ایک ایک دن بلکہ ایک ایک گھنٹا جی جان سے جُتا رہے، اپنی جان کھپا دے۔ پورے ستّر برس، ہر رات بہتر کل کی امّید میں سونے کے لیے وہ اس طویل مدّت کا ہر دن اپنے گاڑھے پسینے سے روری کمانے میں بتا دے، اور کس لیے؟ تاکہ انجام کار وہ اپنی باقی ماندہ زندگی کسی دُھتکارے ہوئے کتّے کی طرح اکیلے یوں بیٹھ کر کاٹے۔ ذرا دیکھو تو، بالکل اُس قطبی جانور کی طرح دِکھتا ہے جس کا سارا فر اُدھڑ چکا ہو۔ کیا تم مان سکتے ہو کہ کوئی زندہ یہ سب حاصل کرنے کے لیے ستّر برس گزارے؟ اپنے حلق سے تو اُترتا نہیں۔"

ایک بار پھر اس نے ہمیں گھُور کر دیکھا اور اپنی ہتھیلیوں پر نظر جما کر اپنی پُرجوش خطابت جاری رکھی۔

"ذرا غور کرو، ستّر بےمصرف بےمعنی سال! ذرا سوچو تو، ستّر برس تک اسی ایک ڈگر پر چلے جانا، ایک ہی سمت، ایک ہی حد، وہی ایک سا افق، وہی یکساں باتیں — ناقابلِ برداشت!"

"بےشک بوڑھے کو تمھارے نقطۂ نظر سے اختلاف ہو گا۔ ممکن ہے وہ اس انجام کو اپنی زندگی کے اصل انجام سے مختلف سمجھتا ہو؛ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسی انجام کا خواہاں ہو۔ کیوں نہ اسی سے پوچھ لیں؟"

ہم اس کے پاس جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ جب ہم اس جگہ پہنچے جہاں وہ بیٹھا تھا تو اس نے نظریں اٹھائیں، سردمہری سے ہمارے سلام کا جواب دیا اور ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ آدھ گھنٹے دروازے میں سے ہم اس کی کٹیا میں دیکھ سکتے تھے۔ ایک کونے میں ایک پھٹا چیتھڑا بچھونا پڑا تھا جب کہ اس کے سامنے والا کونا ایک مربّع چٹان تھی جس پر بند سیپیوں کی ڈھیری لگی تھی۔ کچھ دیر خاموشی طاری رہی جسے بوڑھے کی نحیف آواز نے توڑا۔

"سیپیاں خریدو گے؟ میں سیپیاں بیچتا ہوں۔"

چوں کہ ہمارے ذہن میں اس سوال کا جواب تیار نہیں تھا، اس لیے ثاقب نے سوال کر دیا۔ "کیا آپ انھیں خود اکٹھا کرتے ہیں؟"

"میں پانی کے اترنے کا انتظار کرتا ہوں تاکہ دور تک انھیں تلاش کر سکوں۔ میں ان کو جمع کر لیتا ہوں اور اُن لوگوں کے ہاتھ بیچ دیتا ہوں جنھیں ان کے اندر موتیوں کی تلاش ہوتی ہے۔"

ہم نے آپس میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ثاقب نے وہ سوال کیا جو ہمارے ذہنوں میں اٹکا ہوا تھا۔

"آپ خود ان سیپیوں میں موتی کیوں تلاش نہیں کرتے؟"

"میں؟"

اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے پہلی مرتبہ اسے اپنے وجود کا احساس ہوا ہو یا جیسے یہ خیال اس کو پہلے کبھی نہ آیا ہو۔ پھر اس نے اپنے سر کو ہلایا، مگر خاموش رہا۔

"ایک ڈھیری کتنے کی دیتے ہیں؟"

"سستی۔ دو ایک نان کے عوض۔"

"چھوٹی چھوٹی سیپیاں ہیں۔ ان میں موتی تو کیا ہوں گے؟"

بوڑھے نے ہماری طرف اپنی گھنی پلکوں میں دھنسی بُجھی بُجھی آنکھوں سے دیکھا۔

"سیپیوں کے بارے میں تم کیا جانو؟" اس نے بیزاری سے کہا۔ "کون کہہ سکتا ہے موتی ہو گا یا نہیں؟" اور پھر اس خوف سے وہ فوراً ہی خاموش ہو گیا کہ کہیں بات بڑھانے سے سودا ہی موقوف ہو جائے۔

"آپ بتا سکتے ہیں؟"

"نہ، کوئی نہیں بتا سکتا۔" اور اپنے سامنے پڑی ایک سیپی سے کھیلنے لگا جیسے ہماری موجودگی سے بےخبر ہو۔

"ٹھیک ہے، ہم ایک ڈھیری لے لیتے ہیں۔"

بوڑھے نے مڑ کر مربّع چٹائی پر رکھی ڈھیری کی طرف اشارہ کیا۔

"دو نان لے آؤ۔" اس کی آواز میں خوشی لہرا رہی تھی، "اور وہ ڈھیری تمھاری۔"

جب وہ ڈھیری لے کر ہم اپنے مقام پر آئے تو ہماری بحث پھر چل نکلی۔

"میرے خیال میں وہ آنکھیں کسی پاگل ہی کی ہو سکتی ہیں۔ اگر نہیں تو وہ موتی مل جانے کی امید میں ان سیپیوں کو کھول کر کیوں نہیں

دیکھا؟"

"شاید کوشش کر کر کے وہ اُوب گیا ہو اور اب تماشا کرنا اور تھوڑا بہت کمانا چاہتا ہو۔"

تمام سیپیوں کو کھول کھول کر دیکھنے میں آدھا دن نکل گیا۔ ہم نے چاروں طرف چپچپاتے مادّے اور کھلی سیپیوں کا ڈھیر لگا دیا اور پھر سب اپنے جنوں پر قہقہے لگانے لگے۔

سہ پہر کو ثاقب نے رائے دی کہ میں بوڑھے کے پاس گرم گرم چائے کی پیالی اس امید پر لے جاؤں کہ شاید اس کے دل کو کچھ خوشی مل جائے۔

میں جب اس کے پاس چائے لے جانے لگا تو مجھے ڈر سا لگا۔ بہرحال اس نے مجھے بیٹھنے کو کہا اور بڑے شوق سے چائے پینے لگا۔

"سیپیوں میں کچھ ملا؟"

"نہیں، کچھ نہیں۔ آپ نے ہمیں بےوقوف بنا دیا۔"

اس نے دکھ بھرے انداز میں اپنے سر کو ہلایا اور ایک چسکی لی۔

"صرف دو ماہ بھر" اس نے جیسے اپنےآپ سے کہا اور اپنے سر کو ایک مرتبہ پھر ہلا دیا۔ اچانک اس نے میری جانب نظریں گھمائیں اور پُرجوش ہو کر سمجھانے لگا۔

"اگر یہ سیپیاں تمھاری زندگی ہوں -- میرا مطلب ہے ہر سیپی تمھاری زندگی کا ایک سال ہو اور باری باری تم ہر ایک کو کھولو اور ان کو خالی پاؤ، تو کیا تم اسے ہی غم زدہ ہو گے جتنا دو ماہ گنوا کر؟"

وہ سارے وجود سے کپکپایا اور اس لمحے مجھے اعتبار آ گیا کہ میں کسی ایسے آدمی کے سامنے ہوں جو یقیناً پاگل ہے۔ اس کی گھنی پلکوں میں چھپی آنکھوں میں اس وقت بہت تیز اور غیرفطری چمک تھی جبکہ اس کے پھٹے پرانے لباس کی گرد سہ پہر کی دھوپ میں جگمگا رہی تھی۔ مجھے کچھ کہنے کو الفاظ نہ مل سکے۔ میں نے جب اپنی جگہ سے اٹھنا چاہا تو اس نے میری کلائی پکڑ لی۔ اس کا نحیف ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا مگر کپکپا رہا تھا۔ میں نے اسے کہتے سنا؛

"ڈرو نہیں۔ میں پاگل نہیں ہوں جیسا کہ تم سمجھتے ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ میں تمھیں کچھ بتاتا ہوں۔ میری زندگی کے خوشگوارترین لمحے بھی ہوئے بس جب میں اس قسم کی مایوسی کا تماشا دیکھتا ہوں۔"

کچھ پُرسکون ہو کر میں دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس دوران وہ امی کو یوں

Scanned with CamScanner

دیکھتا رہا جیسے میری موجودگی سے بےنیاز ہو، جیسے ابھی ابھی اس نے مجھ سے بیٹھنے کو نہ کہا ہو۔ وہ مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا،

"میں جانتا تھا تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ یہ سیپیاں ابھی چھوٹی ہیں اور ان میں موتی کا دانہ نہیں بن سکتا۔ مگر پھر بھی میں جاننا چاہتا تھا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور سمندر کی سمت دیکھنے لگا۔ پھر منہ ہی منہ میں جیسے خود سے ہم کلام ہوا،

"آج رات پانی جلدی اترے گا۔ مجھے اب چلنا چاہیے تاکہ سیپیاں اکٹھی کر سکوں۔ کل تم جیسے دوسرے لوگ آئیں گے۔"

حیرت میں ڈوب کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ سدے کا قلعہ ڈوبتے سورج کی روشنی میں تنا کھڑا تھا۔ میرے ساتھی سیپیوں کے خولوں کے ڈھیر کے پاس چائے پی رہے تھے کہ بوڑھا اترتے پانی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا اور وقفے وقفے سے جھک جھک کر سمندر کی چھوڑی ہوئی سیپیاں اٹھانے لگا۔

آج

خزاں ۱۹۸۹

تاراشنکر بنرجی ستیہ جیت رے اسد محمد خان
محمد خالد اختر ڈونلڈ بارتھیلم ولیم سیرویان
افضال احمد سید ذی شان ساحل نسرین انجم بھٹی سعید الدین
نیر مسعود فروغ فرخ زاد بابا مقدم

سرما ۱۹۹۰

نجیب محفوظ لیو تالستائی کم ضوبرو
مظفر علی سید فہمیدہ ریاض عذرا عباس
احمد فواد محمد خالد اختر اکرام اللہ

بہار ۱۹۹۰

اتالو کلوینو امین مالوف محمد عمر میمن
محمد سلیم الرحمن جیک لنڈن محمد انور خالد
رینا الیاس محمد خالد اختر تادیوش روزیووچ
زبگنیو ہربرٹ وسلاوا شمبورسکا الیگزانڈر واٹ

گرما ۱۹۹۰

وجے دان دیتھا انور خان حسن منظر
محمد سلیم الرحمن شمس الرحمن شمس الحق
فہمیدہ ریاض

خزاں ۱۹۹۰

منوچہر خسروشاہی بابا مقدّم جمال میرصادقی
ثروت حسین ذی شان ساحل اوکتاویو پاز
یہودا امیخائی جولین بارنز فاروق خالد
محمد خالد اختر علی امام نقوی
خورخے لوئس بورخیس

Scanned with CamScanner

سرما ۱۹۹۱

افریام یوشوا　　صلاح الدین محمود

فہمیدہ ریاض　　نیّر مسعود

یانیس رتسوس　　انطون شمّاس

اسما راجا　　ولاس سارنگ

بہار ۱۹۹۱

خصوصی شمارہ

گابریئل گارسیا مارکیز

گرما / خزاں ۱۹۹۱

منوج داس　　ضمیرالدین احمد　　نیّر مسعود

اکرام اللہ　　خالدہ حسین　　نکانور پارا

افتخار جالب　　اوسپ ماندلستام　　افضال احمد سید

عذرا عباس　　میری پین　　ذی شان ساحل

گریگور فان ریزوری

سرما ۱۹۹۲

خصوصی شمارہ

مصر، جنوبی افریقا، موزمبیق، زمبابوے،

ہندوستان، امریکا، میکسیکو،

انگلستان، آئرلینڈ اور اٹلی

کی کہانیاں

بہار ۱۹۹۲

معاصر اردو فکشن : تیرہ کہانیاں اور ایک ناول

نیّر مسعود　　اسد محمد خاں

حسن منظر　　مسعود اشعر

انور خاں　　قمر احسن

فہمیدہ ریاض　　صغیر ملال

گرما / خزاں ۱۹۹۲

محمد خالد اختر   اسد محمد خاں

نیّر مسعود   فہمیدہ ریاض

افضال احمد سیّد   میروسلاو ہولب

سیموں دُ بووار   ژاں ژنے

سرما ۱۹۹۳

پریم چند   گابریئل گارسیا مارکیز   لڈ بیوز

فہمیدہ ریاض   ضمیرالدین احمد

ذی شان ساحل   سعیدالدین   محسن خاں

آئزک باشیوس سِنگر

سالانہ خریداری

چار شماروں کی قیمت : دو سو روپے

Scanned with CamScanner

فہمیدہ ریاض

کا سفرنامۂ بنگلادیش

زندہ بہار

جلد شائع ہو رہا ہے

ناشر : مکتبۂ دانیال، صدر، کراچی

آج کی کتابیں

ضمیر نیازی

کی معروف اور اہم تصنیف

The Press in Chains

کا اردو ترجمہ

صحافت پابند سلاسل

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

گابریئل گارسیا مارکیز

منتخب تحریریں

آج : بہار ۱۹۹۱

کتابی شکل میں

بہت جلد شائع ہو رہا ہے

Scanned with CamScanner

قیمت : چالیس روپے

آج کی کتابیں

بی ۱۳ سیکٹر ۱۱ بی نارتھ کراچی ٹاؤن شپ کراچی ۷۵۸۵۰

تقسیم کار

مکتبۂ دانیال صدر کراچی

ٹامس اینڈ ٹامس بک سیلرز صدر کراچی

کلاسیک شاہراہ قائداعظم لاہور

بیکن بکس گلگشت ملتان